قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور نمبر ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدّین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور نمبر ۱۱

جولائی ۱۹۹۲ء

جلد ۴۵ ——— شمارہ ۷

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
نفسِ واحدہ	سیّد عبدالودود	۱۰
اپنی آنکھ قرآن کی روشنی	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۱۵
قرآن کا معاشی نظام	صلاح الدین اکبر	۲۷
قرآنی وصیت	عبداللہ ثانی	۳۸
افتتاح ڈان ماڈل سکول	خطاب سیّد عبدالودود	۴۴
ابنِ آدم جاگ ذرا	ساجد محمود	۴۸
پہلا قدم	آصف جلیل	۵۲
ایک خط ایک سوال	علی محمد چدھڑ	۵۴
قرآن خوانی یا قرآن فہمی	حنیف وجدانی	۵۸
حقائق و عبر	ادارہ	۶۰
باب المراسلات	ادارہ	۶۲
استفسارات	ادارہ	۶۵
اشتہارات	ادارہ	۶۷
بچوں کا صفحہ (اردو)	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷۳
بچوں کا صفحہ (انگریزی)	〃	۷۶
عذابِ قبر (انگریزی)	ڈاکٹر سیّد عبدالودود	۷۸

لمعات

علاج اس کا....

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کا پیام ہم نوایانِ زمزمۂ قرآنی کے نام

اس میں شُبہ نہیں کہ حصولِ پاکستان کے بعد ہم نے نمایاں طور پر مادّی ترقّی کی ہے۔ لیکن اس میں بھی کو ئی شک نہیں کہ اس دوران میں ہم شرفِ انسانیت سے جس قدر عاری ہو گئے ہیں اور ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کی مثال بھی بمشکل مل سکے گی۔ مجھے اس کے لئے نظائر و شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم میں سے کون ہے جسے انسانیت سوز معاشرہ کی تلخ کامیوں کا تجربہ نہیں۔

لیکن جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، وہ ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں، اس وقت ساری دنیا میں حالت یہ ہو چکی ہے کہ شیطنت ابھرتی چلی آ رہی اور انسانیت سمٹتی چلی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے جو معاشرتی عیوب اور اخلاقی ذمائم، قانون شکن اور جرائم پیشہ عناصر تک محدود ہوتے تھے، وہ اب سوسائٹی کا عام چلن بنتے جا رہے ہیں، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس جہنّم نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اگرچہ تفصیل میں جانے سے اس کے متعدد اسباب و علل سامنے آئیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ، مغرب کا جمہوری نظام ہے جسے کامل یا ناقص طور پر، قریب قریب تمام اقوامِ عالم نے اپنا لیا ہے یا اپنا رہی ہیں۔ نظر بہ ظاہر، یہ چیز بڑی عجیب سی دکھائی دے گی کہ جس نظام کو انسانی ہیئت اجتماعیہ کا معراج سمجھا جاتا ہے اور جسے دنیا تمام انسانی مشکلات کا حل قرار دے رہی ہے، اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ دنیا جس جہنّم میں اس وقت مبتلا ہے اس کی بنیادی وجہ وہی نظام ہے۔ لیکن ہے یہ حقیقت۔ جمہوری نظام کا ماحصل یہ ہے کہ ملک میں وہی کچھ ہو جسے ملک کی اکثریت پسند کرے۔ جس فرد یا پارٹی کو جمہوری طریق سے کامیاب ہونا ہو، اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ ووٹ اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو راضی رکھ سکیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو جائے، جب قانون شکنی کا چلن عام ہو جائے، جب سلب و نہب معاشرہ کا وطیرہ بن جائے، جب ہوسِ زر پرستی ہر اس شخص کو پاگل بنا رہی ہو جس کا معاشرہ میں کچھ اثر ہے

جب (پنجابی محاورہ کے مطابق) "چور اُچکا چوہدری اور غُنڈی رَن پردھان" بن جائے، تو اس وقت جو فرد یا جماعت اس روش کی روک تھام کے لئے کوئی اصلاحی قدم اٹھائے یا بدکرداروں کو ان کی بدکرداری سے روکے یا سرزنش کرے، اسے ووٹ نہیں مل سکیں گے۔ اس لئے وہ کسی قسم کے اصلاحی اقدام کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کے جمہوری نظام میں معاشرہ میں کسی قسم کی ریفارم نہیں ہو سکتی اور جب معاشرہ میں ریفارم نہ ہو سکتی ہو تو پھر برائیوں کے عام ہونے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جس تیزی سے جرائم بڑھ رہے ہیں، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ کچھ اس وقت ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں مذہب پرستی کا چرچا زیادہ ہے، وہاں یہ جمہوری نظام اور بھی زیادہ تباہ کن نتائج کا موجب بن رہا ہے۔

مذہب پرستی (دین کی پابندی نہیں بلکہ مذہب پرستی) ہمیشہ جہالت میں پنپتی اور توہم پرستیوں میں پروان چڑھتی ہے۔ جس ملک میں مذہبیت زیادہ ہوگی اس میں مذہبی پیشوائیت کا زور ہوگا، اس لئے کہ مذہب کے معاملہ میں عوام ہوئے ہی مذہبی پیشواؤں کے اثر میں ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی مفاد پرستی کا راز اس میں ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں سرِمُو فرق نہ آنے پائے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص کسی ایسی بات میں جو پہلے سے ہوتی چلی آ رہی ہے، ذرا سی بھی تبدیلی سوچے گا، تو مذہبی پیشوائیت لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جائے گی اور جب مذہبی پیشوائیت اس کی مخالفت کرے گی تو عوام خود بخود اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ لہٰذا، جو فرد یا جماعت، جمہوری طریق سے کامیاب ہونا چاہے، وہ ان مذہبی پیشواؤں کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کرے گی۔ یوں، ایسے ممالک میں جہاں مذہبیت زمیں گیر ہو، ڈیماکریسی کے پردے میں تھیاکریسی حکومت کرتی ہے اور جسے آزادی سمجھا جاتا ہے وہ غلامی کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے، ان الفاظ میں بے نقاب کیا تھا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

معاشرہ میں اصلاح صرف قرآن کے مشاورتی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اس نظام سے مفہوم یہ ہے کہ وحیٔ خداوندی کی طرف سے عطا شدہ، کچھ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول ہیں جن کے تابع معاشرہ کی ہیئت اجتماعیہ کو بہرحال رہنا ہے۔ ان اصول و اقدار میں کسی قسم کے تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کا اختیار، اکیاون فیصد تو ایک طرف، ملک کی سو فیصد آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس قوم کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ ان اقدار و اصولات کو، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ملک میں نافذ کس طرح کیا جائے۔ اس فریضہ کو یہ قوم باہمی مشاورت سے سرانجام دیتی ہے۔ اس نظام کی علمبردار جماعت کو یہ نہیں دیکھنا ہوتا کہ ملک کی اکثریت کیا چاہتی ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وحی کی راہنمائی کا

تقاضا کیا ہے۔ یہ نظام' قوم کی خواہشات و آراء کے پیچھے نہیں چلتا، قوم کو وحیٔ خداوندی کے پیچھے چلاتا ہے۔ اس نظام کا داعی اس آواز کو اُس وقت بھی بلند کرتا ہے جب دنیا میں کوئی ایک فرد بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا اور اسے بلند کئے چلا جاتا ہے خواہ اکثریت اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے۔ اس نظام کی کامیابی ووٹوں کی گنتی پر نہیں ہوتی۔ ان غیر متبدّل اصول و اقدار کی کارفرمائی پر ہوتی ہے۔ اور چونکہ آج دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کی کارفرمائی کہیں نہیں اس لئے ہر جگہ شیطنت کھلے بندوں ناچ رہی ہے ـــــ کہیں خدا فراموشی کی عریانی کے ساتھ اور کہیں خدا پرستی کے پُرفریب لبادوں میں لپٹی ہوئی۔

میں نے شمعِ قرآنی کی روشنی میں' آج سے تیس سال قبل' یہ آواز بلند کی کہ انسانیت کی نجات و فلاح کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے وحی کی عطا کردہ اقدار کی کارفرمائی۔ تحریکِ پاکستان سے میری وابستگی اور مسئلۂ تشکیلِ پاکستان سے میری شیفتگی' اسی جذبہ کی رہینِ منت تھی اور حصولِ پاکستان کے بعد' میری تمام تگ و تاز کا مرکز اور سعی و عمل کا محور بھی یہی قبلہ مقصود ہے۔ تیس سال سے میرے سامنے ایک ہی منزل ہے اور میرا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے۔

آپ اس حقیقت کو برسوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ دین سے مقصود و مفہوم کیا ہے اور آپ کی تحریک کا مدعا و منتہیٰ کیا۔ آج میں اس تمام تفصیل کو چند لفظوں میں سمٹا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ چیز ایک "فارمولا" کی طرح (جسے ہماری بچپن کی زبان میں گُر کہا کرتے تھے) ہر وقت آپ کے سامنے رہے۔ اسے غور سے سنیئے اور حرزِ جان بنایئے۔

(۱) خدا کی تمام مخلوق میں' اختیار و ارادہ صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس کا یہی امتیاز اس کے شرف کا موجب ہے۔

(۲) جہاں جس انسان کا اختیار و ارادہ سلب ہوا' وہ مقامِ آدمیت سے گر گیا۔ اختیار و ارادہ کے سلب ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے فیصلے اور منشار کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۳) دین نام ہے اُس نظام کا جس میں کوئی فرد' اپنے آپ کو کسی اور کے فیصلے ماننے پر مجبور نہ پائے۔ واضح رہے کہ خود اس نظام کے فیصلوں کی پابندی کسی فرد کے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتی۔ اس لئے کہ جب وہ فرد اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لاتا ہے' تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس نظام کے فیصلوں کو بطیبِ خاطر قبول کرتا ہے۔ اگر وہ کسی وقت اپنے آپ کو اس پر رضامند نہ پائے تو اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس دین کو چھوڑ دے ـــــ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے یہی معنی ہیں۔

(۴) دین کے اس نظام میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں تمام افرادِ معاشرہ دل کی کامل رضامندی سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں' اس لئے انسان کا جو ارادہ محکومیت میں سلب ہوتا ہے' دین کے نظام میں وہ مجروح و مصلوب نہیں ہوتا۔

(۵) دوسری قربان گاہ جس پر انسان کا اختیار و ارادہ ذبح ہوتا ہے، ضروریاتِ زندگی کی احتیاج ہے۔ دین کے نظام میں کوئی فرد اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس مقام پر بھی شرفِ انسانیت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ میں جب اس گوشے سے متعلق قرآنِ کریم کی تعلیم پر غور کرتا ہوں تو میری نگہِ بصیرت وجد میں آجاتی ہے اور میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہوں کہ

ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

حاجتمندوں کی امداد تو اور معاشروں میں بھی ہوتی ہے لیکن دیکھئے کہ وہاں شرفِ انسانیت کس طرح مجروح ہی نہیں ذبح ہوتا ہے۔ اس امداد کی شکل اور طریق کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کی روح، خیرات (CHARITY) کی ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خیرات دینے والا، لینے والے سے اپنے آپ کو بہرحال اونچے مقام پر سمجھتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جونہی کسی دینے والے نے اپنے آپ کو لینے والے سے اونچا سمجھا، وہ خود مقامِ آدمیت سے گر گیا۔ یہی وہ لغزش کی غیر محسوس لیکن بڑی خطرناک گھاٹی ہے جس سے محفوظ گزرنے کے لئے قرآن کریم، دینے والوں کے اندر یہ نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ ان کے دل میں، اس کا معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کی بھی تمنا بیدار نہ ہو۔ (اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ لیکن قرآن، اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دینے والے کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا نہ ہو، لیکن لینے والا تو اپنے آپ کو زیرِ بارِ احسان سمجھے گا ہی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اس کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا ہو گیا تو وہ بھی شرفِ انسانیت سے عاری ہوگیا۔ اس کے لئے وہ لینے والے کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے وہ اسے خیرات سمجھ کر نہ لے بلکہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرے۔ (وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴) سے یہی مراد ہے)۔ یہ خصوصیت آپ کو قرآنی نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ یہ اس باب میں منفرد اور عدیم النظیر ہے۔ دین کا منتہیٰ و مقصود، شرفِ انسانیت کا تحفظ اور تکریمِ آدمیت کی بالیدگی ہے اور یہ صرف قرآن کے نظام میں ممکن ہے۔

(۶) یہ ہے دین کا وہ نظام جس کے احیاء کے لئے طلوعِ اسلام کی تحریک وجود میں لائی گئی ہے۔ یعنی اس سے مقصود اس معاشرہ کی تشکیل ہے جس میں کوئی فرد کسی دوسرے کے فیصلے ماننے پر مجبور نہ ہو ــــ حتیٰ کہ اور تو اور، وہ خدا کے فیصلے بھی بجبر و اکراہ قبول نہ کرے ــــ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ اس معاشرہ کا بنیادی آئین ہوتا ہے۔ غیر قرآنی معاشرہ میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں پاتا، ہر شخص کسی نہ کسی مجبوری کے تحت زندگی کے دن گزارتا ہے۔ ان میں بعض مجبوریوں کی زنجیریں تو محسوس طور پر سامنے آجاتی ہیں لیکن بیشتر زنجیریں

ایسی ہوتی ہیں جو کسی کو دکھائی نہیں دیتیں، لیکن محسوس زنجیروں سے کہیں زیادہ مضبوط اور ان کی گرفت کتنی ہی زیادہ شدید ہوتی ہے۔

جہاں تک تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعلق ہے یہ چومکھی لڑائی لڑ رہی ہے۔ چومکھی بھی کیوں؟ اس جنگ کے مکھوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کبھی تنہائی میں سوچئے کہ وہ کونسا گوشہ ہے جہاں سے قرآنی آواز کی مخالفت نہیں ہوتی یہ آواز تو، حضورؐ نبیٔ اکرم کے ارشادِ گرامی کے مطابق "عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے"۔ بات ہے بھی واضح۔ قرآن لاالٰہ کا نقیب ہے۔ یعنی اللہ کے سوا ہر الٰہ کا مخالف۔ اور "الاہوں" کا دنیا میں شمار ہی نہیں۔ ان ساری مخالفتوں کے ہجوم میں تحریک اپنے نصب العین کی طرف تندہی سے گامزن ہے۔ اس نے نہ کبھی کوئی ہنگامہ برپا کیا، نہ خلفشار مچایا۔ یہ نہایت خاموشی سے اپنے پیغام کو عام کرتی چلی جا رہی ہے۔ بایں ہمہ ایسے احباب بھی ہوں گے جن کے نزدیک طلوعِ اسلام محض ایک ذہنی تحریک ہے ـــــ یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اور بہت بڑی خود فریبی کا موجب۔ قرآن کو بے شک سمجھا ذہنی طور سے ہی جاتا ہے، لیکن اس کا مبسط در حقیقت انسانی قلب ہے۔ اگر قرآن کا فکری طور پر سمجھ لینا، انسان کی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو اس فکری کاوش کا کچھ فائدہ نہیں ـــــ اگر آپ کسی نسخہ کے اجزاء کے خواص و اثرات کا پورا پورا علم رکھتے ہیں لیکن اسے استعمال کر کے اپنے مرض کا ازالہ نہیں کرتے تو اس نسخہ کے متعلق آپ کی یہ معلومات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اگر اس فکر سے آپ کے کردار میں بلندی اور سیرت میں پاکیزگی نہیں پیدا ہوتی تو آپ اس کاوش میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ آپ کا مستقبل، آپ کے علم سے نہیں، اخلاق سے سنورے گا۔ یوں بھی جس کا کردار پاکیزہ نہیں، وہ قرآن کو کماحقہٗ سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۹) اس کے لئے خدائی سند موجود ہے کہ جس کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی نہیں اسے اس قرآن سے کیا مس ہو سکتا ہے۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کا متلاشی اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ

ہم دل کا دیا جلا کے لائے
تب جا کے ترا سراغ پایا

اگر آپ کے "دل کا دیا" نہیں جل رہا تو آپ کے ماتھے کی آنکھوں کی بصارت آپ کو راستہ نہیں دکھا سکتی اور دل کے دیئے کی لَو کا مظاہرہ انسان کی سیرت و کردار سے ہوتا ہے۔ اسی لَو سے اس کی اپنی زندگی کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور یہی دوسروں کے لئے بھی قندیلِ راہ بنتی ہے۔

یہ تو رہا قرآنی تعلیم کو خود سمجھنے کا معاملہ۔ لیکن جس نے اس تعلیم کو دوسروں تک پہنچانا ہو، اس کی ذمہ داری اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جب جماعتِ مؤمنین سے کہا تھا کہ "تمہارے لئے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ

ہے۔" تو اس میں داعی اِلی القرآن کی اس ذمہ داری کی طرف بھی اشارہ تھا۔ یعنی اس کی زندگی ایسی ہونی چاہیئے جو دوسروں کے لئے نمونہ ہو۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ مقام ہے جس میں حضورؐ کی رفعتِ شان اور عظمتِ مقام جگمگاتے ستاروں کی طرح نور پاش نظر آتی ہے۔ خدا نے تو یہی کہا تھا کہ تمہارے لئے رسولؐ اللہ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کی دعوائے رسالت کے بعد کی زندگی۔ لیکن خود رسولؐ اللہ نے جماعتِ مؤمنین سے نہیں بلکہ اپنے مخالفین سے علی الاعلان فرمایا کہ ــــ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) میں نے اپنے دعوائے رسالت سے پہلے بھی اپنی ساری عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے۔ ذرا عقل و ہوش سے کام لے کر سوچو تو سہی کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے اور فریب کار کی ہوتی ہے یا سچے اور راست باز کی ــــ یہ ہوتی ہے ایک داعیٔ حق و صداقت کی زندگی۔ اگر آج، قرآن کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے والے اپنی سابقہ زندگی کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کی آئندہ زندگی تو ایسی ہونی چاہیئے جو قرآنی تعلیم کی آئینہ دار ہو۔

۲۔ تعلیمی اداروں میں درسِ قرآن کا اجراء

ہم شروع دن سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان، اسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کونسی ہے جس کی ہم اس قدر شکایت کر رہے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ہماری درس گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہی طالب علم بیس بائیس برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوشمند طبقہ بن گئے ہیں اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اسی قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری درس گاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں، وہ ہماری قوم کے اجزاء بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآنِ کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔

لہٰذا، ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا میں کوئی معاملہ سامنے آئے، وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دار العلوم الگ کھولے جائیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا طریق یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے یا ایم۔ اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ، وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ــــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

"فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے"۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

الحمد للہ کہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (کالجز) پنجاب نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، محدود پیمانے پر ہی سہی، مارچ ۱۹۹۲ء سے پنجاب کے تمام کالجوں میں پندرہ روز درسِ قرآن کے لئے احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ ہم ڈائریکٹر صاحب موصوف کے اس جرأت مندانہ اقدام پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان سے گذارش کریں گے کہ اس سلسلے کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہوگا کہ روایتی واعظوں سے ہٹ کر درسوں کے موضوعات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ طلباء کے تعلیمی اسباق اور روزمرہ مشاہدات سے مطابقت رکھتے ہوں تاکہ طلباء جان سکیں کہ وقتاً فوقتاً سامنے آنے والے مسائل کے متعلق قرآن کیا راہنمائی دیتا ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ اسلامی مملکت کا نظام

کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ کون سی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا قدم غلط سمت کو اُٹھ گیا ہے، اور دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآن ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ درس دینے والے حضرات کا پینل اور درسوں کے موضوعات ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن خود مقرر کریں تاکہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ طلبا میں فکری ہم آہنگی بھی قائم رہے۔ یہ سلسلہ اگر خوش اسلوبی سے قائم رہا تو اس سے نہ صرف طلبا کے قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں گے بلکہ اگر وہ سیرتِ نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو ان میں سے ایسے انسان یقیناً پیدا ہو سکتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

طلوعِ اسلام

ایک ماہنامہ ہی نہیں، ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے

جس کا مقصد فکرِ قرآنی کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوان طبقہ کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے صحیح آسمانی انقلاب بن کر اُبھرے۔ اس سلسلہ میں اس تحریک کے سالانہ اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں جن میں اہلِ علم، نہایت شگفتہ و شاداب انداز میں، حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے اور پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ قرآنی روشنی میں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالودود

نفسِ واحدۃ

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ..... (۴/۱)

ترجمہ جناب اشرف علی تھانوی مرحوم:۔

"اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔"

تفسیر:۔ "اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا ذکر ہے۔ ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا جیسے آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے، دوسرا جاندار کا جاندار سے بلا طریقِ توالدِ متعارف پیدا ہونا جس طرح حوا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئیں۔ تیسرا جاندار کا جاندار سے بطریقِ توالدِ متعارف پیدا ہونا جیسے اور آدمی آدم اور حوا سے اس وقت تک پیدا ہوتے جارہے ہیں ......"

ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم:۔

"لوگو رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے بہت مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے۔"

تفسیر:۔ تم کو ایک جان سے پیدا کیا یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق کی ابتدا ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ خود قرآن اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی۔ "اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا" اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔

اور جو بائیبل میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت بیان کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔"

ہمارے اکثر مفسرین حضرات " اتقو ربکم الذی" کا ترجمہ " ڈرو اس رب سے" کرتے ہیں۔ خدا کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ یہ ایک AUTOCRAT بادشاہ ہے جو ڈنڈا لے کر بیٹھا ہوا ہے اور ہر وقت اپنی مخلوق کو ڈراتا ہے۔

مفہوم محترم پرویز مرحوم: "اے نوعِ انسان اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جرثومۂ زندگی (LIFE CELL) سے کی، ازاں بعد یہ جرثومہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا (SPERMATOZOON اور OVUM) جس سے نر اور مادہ کی تقسیم معرضِ وجود میں آئی اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے اس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلا دی جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔"

اس مسئلہ زیرِ بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے میں بلا خوف و تردید کہوں گا کہ اس آیت (۴:۱) کی تفسیر کسی بھی غیر سائنسدان مفسر کے بس کی بات نہیں۔ ہر مفسر نے اپنے اپنے علم و بصیرت کی رُو سے اسے بیان کر دیا ہے لیکن حقیقت تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔ انسان عرصہ دراز سے محوِ حیرت ہے کہ پہلا انسان کس طرح معرضِ وجود میں آیا۔ ذہنِ انسانی اولیں دور میں اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایک فرد کو تراش لیا جائے اور پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا جائے، اس طرح جب مرد اور عورت وجود میں آجائیں تو پھر افزائشِ نسلِ انسانی کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہ رہ جائے گی۔

ہمارے اکثر مفسرین تحقیق و جستجو کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ تفسیر بیان کرنے میں اگر تو کوئی بنی بنائی کہانی بائیبل سے ہاتھ لگ جائے تو اسے بڑھا چڑھا کر بیان کر دیتے ہیں اور اگر کوئی ایسی کہانی نظر نہ آئے اور اگر نظر آئے بھی تو یہ غیر تسلی بخش ہو تو پھر مسئلہ زیرِ نظر کو مجمل رکھنے میں بہتری سمجھتے ہیں تاکہ اس سے جان چھڑائی جائے۔ تحریف شدہ بائیبل سے ادھار لی ہوئی اکثر کہانیاں بے سروپا ہیں۔ ان کو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ کہ پہلے مٹی کا پتلا بنایا گیا جس میں روح پھونک کر آدم تیار کیا گیا، پھر اس کے جسم سے حوا نکالی گئیں

عیسائیوں کے اندر اس قدر راسخ ہے کہ ان کے گرجوں میں اس عمل کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں. **ذیل کی** تصویر ملاحظہ فرمائیے جو روم کے ایک گرجا گھر میں لگی ہوئی ہے۔

CREATION OF EVE
Sistine Chapel, Vatican, Rome.

اب غور کیجئے کہ ہمارے نامور مفسر جناب اشرف علی تھانوی نے تو یہ من وعن تسلیم کر لیا کہ آدم جو کہ ایک فرد تھا بے جان مادہ سے پیدا کیا گیا، پھر اس جاندار انسان کی پسلی سے جاندار حوّا کو بلا طریقہ توالد پیدا کیا گیا، پھر آدم اور حوّا کے جوڑے سے بطریقِ توالد انسانی نسل معرضِ وجود میں آئی. نامعلوم ہمارے مفسرین اپنے شجرِ علمی کے زور سے

کیوں لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور وہ لوگ ہیں کہ ان بے حقیقت افسانوں کو بے سوچے سمجھے اس لئے تسلیم کئے جا رہے ہیں کہ یہ بڑے بڑے علماء کے قلم کے نکلے ہیں۔ پھر جناب مودودی مرحوم کی تفسیر پر نگاہ ڈالئے آپ تذبذب کی حالت میں ہیں۔ یہاں تک تو تسلیم کرتے ہیں کہ نسلِ انسانی کی ابتدا ایک فرد سے ہوئی ہے جسے آدم کہتے ہیں اور جو عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہی تھا لیکن یہ کہ "اسی سے اس کا جوڑا بنایا" اسے بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں لیکن آخر میں بیان وہی کچھ کرتے ہیں جسے عقل تسلیم نہیں کرتی اور پھر مایوسی کی حالت میں فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کو مجمل رہنے دو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کی TEXT کا ۸/۱ حصہ جو کائنات اور مظاہرِ فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جو ہمارے علماء کی سمجھ سے باہر ہے اسے مجمل رکھنا چاہیئے کیونکہ ان مسائل کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے اور اگر ہے تو انسانی عقل اسے قبول نہیں کرتی۔ پھر مودودی مرحوم نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان مسائل پر خاموش ہے۔ حالانکہ قرآن کریم خاموش نہیں ہے بلکہ بار بار تاکید کرتا ہے ان مسائل پر غور و فکر کرو، کائنات میں بکھری ہوئی ان گنت آیات کو EXPLORE کرو۔ مودودی مرحوم آدم کے متعلق بائیبل کی کہانی کو رد نہیں فرماتے، بلکہ دبی زبان میں اسی کو اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "حضرت حوّا حضرت آدمؑ کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کی گئیں"۔ اب غور فرمایئے کہ انسان کی بارہ پسلیاں دائیں جانب اور بارہ پسلیاں بائیں جانب ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پسلیوں کی تعداد کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے مثلاً گردن کے ساتویں مہرے میں CERVICLE RIB بن جاتی ہے یا بعض اوقات 1ST LUMBER میں بھی ایک پسلی نمودار ہو جاتی ہے لیکن یہ پسلیاں ABNORMAL ہوتی ہیں اور بیماری کی علامت ہوتی ہیں اور اکثر اوقات انہیں کاٹنا پڑتا ہے۔ نامعلوم مودودی مرحوم نے تیرھویں پسلی کا ذکر کیوں ضروری سمجھا اور یہ بھی سوچنا گوارا نہ کیا کہ ایسا فرد جس سے آگے ان کے مطابق نسلِ انسانی نے پھیلنا ہے اسے بیمار کیوں پیدا کیا اور پھر یہ بھی کہ نسلِ انسانی میں تیرہ پسلیوں کا معمول کیوں قائم نہیں رہا۔ پھر مودودی مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں کہ "نوعِ انسان کی تخلیق ایک فرد سے ہوئی اور دوسری جگہ قرآن اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا"۔ حالانکہ سورۂ بقرہ میں جس آدم کا ذکر ہے وہ کوئی فرد نہیں تھا وہاں کسی فرد کا ذکر نہیں ہے بلکہ "آدمی" یا بنی نوعِ انسان کا ذکر ہے۔ قصۂ آدم خود انسان کی سرگذشت ہے اور قرآن نے اسے تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔

پھر مودودی مرحوم فرماتے ہیں کہ حوّا آدمؑ کی بائیں طرف کی تیرھویں پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ پھر روم کے گرجا گھر میں لٹکی ہوئی تصویر پر نظر ڈالئے، حوّا بائیں طرف سے آدم کے جسم سے باہر آ رہی ہیں اور پھر حوّا کی جسامت ملاحظہ فرمایئے اور پھر سوچئے کہ آدم کے جسم کے اندر یہ کیسے سمائی ہوئی تھیں اور ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے کس MECHANISM کے ذریعے باہر آئیں۔ سچ ہے اندھوں کی نگری میں اندھیر ہی اندھیر ہے اور جہاں اندھیر ہو

وہاں مایوسی بھی لازمی امر ہے۔

اب آیئے محترم پرویز مرحوم کے مفہوم کی طرف۔ آپ نے درست فرمایا کہ انسانی زندگی کی ابتدا کسی بنے بنائے انسان سے نہیں ہوئی بلکہ جرثومہ حیات LIFE CELL سے ہوئی۔ لیکن استادِ محترم اس خصوصی LIFE CELL کی وضاحت نہیں فرما سکے کہ جرثومہ ہائے حیات کے ارتقائی منازل میں اس خاص جرثومہ حیات کا مقام کیا ہے۔ یہ کس مرحلے میں معرضِ وجود میں آیا۔ اور ابتدائی جرثومہ ہائے حیات میں اور اس خاص جرثومہ حیات میں کیا فرق ہے۔ یہ بیان کہ پہلے ایک LIFE CELL تھا جو جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک SPERM اور دوسرا OVUM اور پھر ان کے ملاپ سے انسانی نسل شروع ہوئی، درست نہیں۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے جرثومہ ہائے حیات کی پوری تاریخ بیان کرنی پڑے گی اور یہی میرا اصل موضوع ہے۔ اوپر میں جو کچھ لکھ چکا ہوں یہ میرے اسی بیان کی تمہید ہے۔ محترم پرویز مرحوم مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۲۰۶ پر تحریر فرماتے ہیں:

> "کائنات کا تخلیقی آغاز کیسے ہوا؟ چھ ایام سے کیا مراد ہے؟ یہ اور اس قسم کے دیگر کوائف جو قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں، کا تعلق سائنس سے ہے اور ان کی تشریح بڑی ادق اور TECHNICAL ہے۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات کے متعلق میری معلومات مطالعاتی ہیں براہِ راست میری اپنی تحقیق نہیں، کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔"

جرثومہ ہائے حیات کا مسئلہ SCIENCE OF GENETICS سے متعلق ہے۔ زیرِ بحث مسئلہ اگر صرف سائنسدانوں کے لئے بیان کرنا ہو تو مختصر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ قارئین "طلوعِ اسلام" میں اکثر غیر سائنسدان ہیں اس لئے دُور پیچھے جانا پڑے گا۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کا وجود سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (مٹی کے خلاصہ) کے ذریعے ظاہر ہوا نہ کہ سالم مٹی کے پتلے سے۔ چنانچہ پہلے روئے زمین پر کیمیائی ارتقا بیان کرنا پڑے گا جس سے سمجھ آئے گی کہ 'سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ' سے کیا مراد ہے۔ پھر یہ بیان ہو گا کہ ان غیر جاندار اجزاء میں زندگی کی نمود کیسے ہوئی اور جرثومہ ہائے حیات LIFE CELL کس طرح معرضِ وجود میں آئے۔

پھر جرثومہ ہائے حیات کی ساخت اور افعال بیان کرنے کے بعد ان کے ارتقائی منازل کا بیان ہو گا۔ آخر میں وہ جرثومہ حیات جسے نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کہا جاتا ہے اور جو ہماری اس ساری روئیداد کا مرکزی نقطہ ہے، کی نشاندہی کی جائے گی۔ کوشش کی جائے گی کہ بیان مختصر الفاظ میں ہو۔ تاہم اختصار صرف اس صورت میں ہو سکے گا جس سے بات سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ (جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے بچے کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلا تکلف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اُسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے، بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا، اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلہ سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہلِ زبان کا سا لب و لہجہ پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے، اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ وہ اس کی مادری زبان ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچہ کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے، اور وہ نقوش جو چپکے ہی چپکے اس کے لوحِ قلب و دماغ پر آغوشِ مادر میں منقش ہو جاتے ہیں، کیسے انمٹ اور دیرپا ہوتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچہ کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان ہی تک محدود ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دماغ تو بہرحال دماغ ہے۔ جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا؟ زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آجاتی ہے، اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں لیکن خیالات کی اثر پذیری بچے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے۔ اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ لیکن اگر ہم اس کا احساس کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے کرنا چاہا، انہوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیۂ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت

وراثتی اور ماحولی اثرات

ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریاتِ زندگی اور معتقداتِ حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو انکی ابتداء کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کیلئے یہی چیزیں صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتی ہیں۔ جنہیں اس قوم کے افراد نہائت خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے، سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا انکی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین و نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ انسان کی اپنی کوششیں انہیں چاک نہیں کر سکتیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون چاک کرے؟ اس لئے کہ اس ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبداءِ فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس مقام سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر ہے۔ (یعنی وحی کے ذریعہ) لیکن سوال یہ ہے کہ ان پیغاماتِ خداوندی سے ہدائت حاصل کرنے کا طریق کیا ہے؟ اور وہ روش کونسی ہے جس سے اس ہدائت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا۔ اس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ہدائت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے۔ ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں اسی پر نہ چلتا جائے۔ اگر انسان نے فکر و عمل سے کام نہ لیا تو اس پر ہدائت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو

عقلِ انسانی

وہی مستفیض ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷:۱۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کے غلط اعمال کی وجہ سے ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے۔) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں

مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے (وہ عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کر کے) چارپایوں کی مانند ہو گئے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان (ان قوانین کی روشنی میں) اپنی عقل و فکر سے کام لے اور اس طرح زندگی کی صحیح راہوں پر چلتا جائے۔ اس کے برعکس وراثتی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ ضد سے اپنی روش پر جما رہے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے آئے ہیں اور جسے وہ وراثتی اور گرد و پیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا اس دن سے علم و بصیرت اور تقلید و جمود کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کر کے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ مندرجۂ صدر آیات میں مذکور ہے کہ:-

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۷/۱۷۶)

سو اے پیغمبر ان تاریخی سرگزشتوں کو لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں

تاریخی یادداشتیں

قرآن کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان حقیقت کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے کہ وہ پیغام ان کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی۔ لیکن وہ لوگ غور و فکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آ رہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوح علیہ السلام کو لیجئے۔ ان تک پیغامِ خداوندی آیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳:۲۴)

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی

تقلیدِ آباء

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی۔ اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قوم نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ہود علیہ السلام کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ خدائے قہار کی عبودیت،

اختیار کرو تو انہوں نے کہا۔

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ (۷:۷۰)

کیا تم صرف اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں

وہی سازِ کہن کہ جس روش پر اسلاف چلے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے۔ یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں، کوئی برہان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط یہی کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قوم ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مردِ صالح سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اُس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ کیسا افسوس کا مقام ہے! اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۱۱:۶۲)

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تُو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار کریں جن کی عبادت ہمارے اباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔

ایسا ہی جواب حضرت شعیب علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ جب انہوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رُو سے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے تھے تو قوم نے جواب دیا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ

قوم نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے آئے ہیں یا یہ کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز

آدمی رہ گئے ہو۔ (۸۷ : ۱۱)

غور کیجئے اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک رہی ہے؟ یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی تنہا راہ راست پر ہے؟ اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انہیں معصوم و منزّہ عن الخطاء سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے۔

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور حضرت ہارون علیہ السّلام ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے۔ چونکہ ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انہوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے ماتحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (۷۸ : ۱۰)

انہوں نے کہا کہ تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے۔ اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں حکومت تم دونوں بھائیوں کیلئے ہو جائے ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں۔

ملّتِ حنیفہ کے موسس اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آئے تھے تو انہیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۵۳ : ۲۱)

انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ انہی کی پرستش کیا کرتے تھے۔

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور جن کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورہ ابراہیم میں تمام اقوامِ سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۰ : ۱۴)

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں ان سے ہمیں روک دو۔

قرآن اور اسلاف پرستی

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا، قرآن کی شکل میں مہرِ عالمتاب بن کر چمکا تو شپرہ چشم لوگوں نے حسبِ معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم آنکھیں نہیں کھولیں گے، اس لئے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)

بلکہ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے جا رہے ہیں۔

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد جب معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر وراثتی اثرات کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہِ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کیلئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آباؤ اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے۔ کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ انکی یہ روش کچھ انوکھی نہیں، بلکہ مسخ شدہ ذہنیتوں کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے مُنہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳: ۲۳)

اور اسی طرح (اے رسول) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خود تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو، کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن ہی پر چلے جاؤ گے؟ یعنی اگر تم اس دعوتِ جدیدہ اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو تو ہم بتائیں کہ یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے۔ لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سدید و محکم نہیں تو اس کا کیا جواب؟

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۴۳:۲۴)

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے) انہوں نے کہا کہ (ہمارے پاس دلیل وحجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دے کر تم بھیجے گئے ہو

یہی جواب سلسلۂ انبیاء کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کر دینے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو پھر بھی تم عقل وہدایت سے انکار کرو گے)

انسانی ضد اور جہالت، بے دانشی اور بے راہروی، وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے، جو انسان کے آنکھ کھولنے کے دن سے لے کر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہدِ مبارک تک مسلسل چلی آرہی تھی۔ لیکن کیا اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہوگیا؟ ختم کیسے ہوسکتا تھا۔ ابلیس نے تو اللہ تعالےٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے۔ سو جب تک ابن آدم دنیا میں موجود ہے۔ ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ عرصہ تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کا اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ شروع میں گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں، غیر شعوری طور پر اپنے آباؤ اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت۔ اس غلط مسلک کو اختیار کئے جائیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدلی تھی اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف و الحاق شروع کر دیا تھا۔ نیز کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا

آج بھی وہی حالت ہے

رسول آتا اور تجدید دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہِ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کیلئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس روش سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہر قدم کا جائزہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے اسے فوراً قرآن کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روشنی پر گامزن رہا۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک فرقہ صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہِ راست پر ہوں اور دوسرے فریق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچیے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں، ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا، تو انکی طرف سے کیا جواب ملتا؟ وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا۔ لیکن اس کو وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ "ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تمہیں ایک راہِ راست پر چلنے والے رہ گئے آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے ملا کرتی تھی وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لاکر قوم سے کہتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کون سی ہے۔ اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی میں تو کچھ نہیں کہتا کہنے والی خدا کی یہ کتاب ہے۔ ان کی طرف سے اس کا کیا جواب ملتا ہے؟ اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت! کہ لو بھائی یہ آگیا کہیں سے بڑا معتبر ابھلا ہمارے اسلاف قرآن نہیں جانتے تھے؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث وجدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش! تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق

ہے یا نہیں۔ اس کا بھی یہی جواب ملتا ہے کہ ہمیں پرکھ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اسلاف نے سب کچھ دیکھ پرکھ لیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے تو اس سے اس کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔

قرآن میں آباء کی روش

بالخصوص جب کہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں لیکن تنقید کی حد سے بالا صرف وحیٔ الٰہی ہوتی ہے۔ غلطی کا امکان ہر انسان سے ہوتا ہے۔ اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ ہم اپنے ہم عصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہمعصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جاتے ہیں۔ اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا یا انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنا کس دلیل کے ماتحت ہو سکتا ہے؟ محض یہ اتفاق کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے، اسے منزہ عن الخطاء نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہو جاتی۔ ہر شخص کا فہم، ادراک، تحقیق اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر زمانہ ما بعد کا انسان اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک قابلِ تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحیٔ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے۔ نیز یہ تحقیق و تنقید کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی، بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ زیرِ تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہوا تو ہو المراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کون سی خفت ہو جائے گی؟ قرآن کریم تو وہ کتاب حیات ہے جس کے اتباع کا حکم خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی تھا۔

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶:۱۰۶)

اے رسول جو کچھ تیرے رب کی طرف سے دی گئی ہے تم اسکی پیروی کرو

اس لئے قرآن کریم کے اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا ذاتی خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں رکھنا چاہیئے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شئے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۷۱ : ۲۳) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے۔ دینِ خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی اور یہی حق ہے کہ جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اندھی تقلید کی بناء پر نہیں۔ کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحبِ قرآن (صلعم) ہی کا خاصا و امتیاز تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روش زندگی بتائی گئی ہے ارشاد ہے :-

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸)

(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بناء پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میرا اتباع کیا ہے وہ بھی (اسی حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔ فرمائیے کہ جو نظریات و معتقدات، وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت، اسلاف کی بے جا عقیدتمندی کے تابع اختیار کئے جائیں۔ ان کی دعوت وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟

مسلمان کی روش

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہہ و تنذیر امم سابقہ کے متعلق یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے منکرین کے متعلق تھی، ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوامِ گزشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے اس سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بہ قدم امم سالفہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، تو آپ اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ کونسا مسلک و مشرب ہے جو اسلاف سے منتقل ہو کر آئندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہٰذا حق و صواب کی یہ راہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوشِ قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتابِ زندہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآنِ کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ ہمارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہو، کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا یہی ہوتا ہے

کہ خدائی سند کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے ہمارے اپنے خیالات کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدت مندی پر حرف آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورہ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۲۱ : ۳۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو دیکھا ہے خواہ (اس روش کے مطابق) انہیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو۔

یہ تو انکی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا سوچے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۳۱/۲۲)

اور جس نے اپنے آپ کو بہ خلوصِ قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے

یعنی دین محکم نہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات ہی کا اتباع کرنے لگ جائیں اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بغیر دیکھنے پرکھنے کے اس پر گامزن ہوتے چلے جائیں۔ دینِ قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات، سب کو قرآن کریم کے ترازو میں رکھ دیں جو کچھ اس پر پورا اترے وہ قابلِ تسلیم جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو وہ بلا تأمل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گرانبہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔

اس مسلکِ صحیحہ کے اتباع کی ضرورت یوں تو عام حالات میں بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ ہمارے سامنے ایک نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعبیر آئی ہے جب ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے نئے قالب اختیار کرنے ہیں۔ جب اپنے لئے ایک نیا نظامِ حیات مرتب کرنا ہے۔ اس مسلک کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئینِ نو کی تدوین[1] میں جو مشکل سب سے زیادہ عناں گیر ہو رہی ہے وہ یہی احساس ہے کہ بہت سے احکام اور عقائد جو اسلاف سے متوارث چلے آرہے ہیں ایسے ہیں جو ہماری نئی زندگی کے

---

[1] اس مقالہ کا یہ حصہ تشکیلِ پاکستان کے بعد کا اضافہ ہے۔

تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن چونکہ انہیں مذہب کی مقدّس سند مل چکی ہے اس لئے انہیں چھوڑتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان تصورات کو قائم ہی رکھا جا سکتا ہے نہ چھوڑا ہی جا سکتا ہے۔ قائم رکھنے میں زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ چھوڑنے میں اسلاف کے مسلک کی خلاف ورزی کا احساس دامن گیر ہو جاتا ہے

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را

لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے حقیقی نہیں۔ اس کا علاج واضح ہے۔ یعنی ہم خدا کی کتاب کو اپنا نصب العین قرار دیں۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اسے اس میزان پر تول لیں۔ جو اس پر پورا اُترے وہ قابلِ قبول اور جو پُورا نہ اترے وہ جھٹک کر پھینک دینے کے قابل۔ خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جا رہی ہو۔

(پرویز صاحب کی کتاب "فردوسِ گم گشتہ" سے ماخوذ۔)

فرمودۂ اقبالؒ

تاریخِ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہُوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے وقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص ارادوں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قویٰ کو بے کار کر دے۔ انسانوں کو سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق نہرو کے جواب میں۔ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۸۱ء)

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

قرآن کا معاشی نظام

ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ پہ نظر ڈالیں تو ایک بات بڑی واضح نظر آئے گی کہ اس نے ایک زمانے سے سوچنا چھوڑ رکھا ہے، حالانکہ کلامِ پاک میں متعدد مقامات پر اس کی تلقین ہے، بارہا یاددہانی کرائی گئی، تدبر، تفکر پر زور دیا گیا ہے اور خود اس ذاتِ اقدس کی زبانی کلامِ الٰہی میں کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (۳۴/۴۶)

ذرا غور فرمایئے کائنات کی عظیم ترین ہستی کہہ رہی ہے کہ میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں، بات کی اہمیت اسی سے ظاہر تھی لیکن کہا گیا ہے کہ یہ بات یونہی روا روی میں، چلتے چلتے، یونہی نہیں، زیادہ نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے، رک کر، توجہ سے، غور سے سنو ـــــ اور پھر آپ دیکھیں کہ وہ ایک بات ہے کیا، کوئی مابعد الطبیعاتی مسئلہ نہیں کسی عبادت پہ زور نہیں، کچھ اور نہیں، بات اس ساری تاکید اور احتیاط کے بعد کہی گئی تو وہ صرف یہ کہ ـــــ سوچا کرو۔!

اس سے سوچ کی اہمیت واضح ہو گئی کہ یہ کتنی بڑی اور بنیادی بات ہے، اس سے نگاہ و ذہن میں کشادگی آتی ہے، اسی سے راستے روشن ہوتے ہیں، اسی سے منزل کی نشاندہی، یہ نہ ہو تو زندگی کا سفر اندھیرے کا سفر اور زندگی کی ندی رواں دواں رہنے کی بجائے جمود کا شکار اور ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح بہت جلد سڑانڈ کا شکار ہو جاتی ہے۔

ـــــ تاریخ گواہ ہے کہ اس ملّت کے ساتھ یہی ہوا، علم و ہنر، تہذیب و تمدن، فلسفہ و سائنس میں راہنما قوم، جمود کا شکار ہو کر پستی و پسماندگی کے قعرِ مذلّت میں گر گئی۔

ماضی میں لوٹنے اور گڑے مُردے اکھاڑنے کا تو کوئی فائدہ نہیں، سوچنے کی بات آج کے وہ مسائل ہیں جن

یہ اگر ہم آج کے علم اور حقائق پہ نظر نہ رکھتے ہوئے فیصلے کریں گے تو ایسے بھنور میں پھنس جائیں گے کہ کہیں کے نہ رہیں گے، کہیں نہ پہنچ پائیں گے۔

اس وقت ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو جو مسئلہ درپیش ہے وہ ہے سود کی ممانعت کا، قرآنِ مجید میں ربٰو کو خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے اور درست راہ یہ کہہ کر سمجھائی گئی ہے کہ

و ان تبتم فلکم رؤس اموالکم

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔

یعنی صرف راس المال تمہارا حق ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، اسی سے ربٰو کی تعریف (DEFINITION) سامنے آتی ہے۔ راس المال سے زیادہ ہر رقم ربٰو کے ضمن میں شمار کی گئی ہے۔

اُمّت کا قافلہ مدّت سے بھٹک رہا تھا کہ ایک مردِ راہ داں فریاد کناں ہوا، بھٹکے ہوئے راہی کو پھر سوئے حرم لے چل ــــ وہ اسلام کو اپنی اصلی اور منزّہ شکل میں رائج دیکھنا چاہتا تھا ــــ اور کسی نظام کو نافذ کرنے کے لئے بہرحال ایک خطۂ زمین چاہیئے ہوتا ہے، اس کا خواب اس نے اس برّصغیر میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ مملکت کی صورت میں دیکھا ــــ اور ایک اور دیدہ ور، نئے دَور کے ایک مردِ مجاہد نے اپنی بے مثال فہم و فراست سے اس خواب کی تعبیر مسلمانانِ ہند کو مملکتِ پاکستان کی صورت میں دی۔

اس کی مخالفت ہر گوشے سے ہوئی، اپنوں نے بھی اسے تقسیم پنجاب و بنگال، تقسیمِ مسلمانانِ برّصغیر کے طعنے دیئے مگر وہ خضرِ راہ جانتا تھا کہ محدود سہی، مختصر سہی، یہ خطۂ زمین اگر اسلامی نظام کا گہوارہ بن گیا، تو یہ وہ مینارۂ نور ہوگا جس کی روشنی کی راہ کوئی نہ روک سکے گا (روشنی کی راہ کبھی کوئی روک سکا ہے)۔ یہ روشنی پھیلے گی، بڑھے گی کہ یہی روشنی کا مقدّر ہے۔

اس کی زندگی نے (اور ہمارے مقدّر نے) وفا نہ کی اور ہم زمینداروں، دولت مندوں اور موقعہ پرستوں کے چنگل میں پھنس گئے جو سامراجیوں کے قدرتی حلیف ہوتے ہیں۔

یہاں وقتاً فوقتاً اسلام نافذ کرنے کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، اکثر و بیشتر اسلام کی یہ دہائی سیاسی نعروں کی صورت میں رہی اور ان نعروں کے سہارے اپنی سیاست کی دکان چمکانے اور حکومت بچانے کی تدبیر کی جاتی رہی اور خلقِ خدا، اللہ کے دیئے ہوئے نظام کے فائدوں کو ترستی رہی، اس کے حصّے میں کچھ آیا تو سزائیں، مزا یہ ہے کہ وہ سب حلقے اور ادارے جو خود کو اسلام کا اجارہ دار ظاہر کرتے ہیں سزاؤں کے نفاذ ہی پہ سب سے زیادہ زور دیتے رہے، ایسے قوانین نافذ کرنے والوں کی تعریف میں رطب اللسان رہے، کسی نے اربابِ اختیار کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ان کے سزاؤں کے نفاذ سے پہلے اسلامی معاشرہ تو تشکیل دے لو، وہ معاشرہ

کو قائم کرلو، وہ معاشرہ تو تشکیل دے لو جہاں کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، جہاں کوئی جرم پر مجبور نہ ہو، وہ اسلامی انقلاب تو زندگیوں میں لے آؤ جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کا مظہر ہو، پہلے جرائم کے محرکات اور اسباب کو ختم کرو، اس سے پہلے یہ سزائیں عدل و انصاف کے تقاضوں پر کیسے پوری اُتر سکیں گی۔

استحصالی نظام کو جوں کا توں رہنے دے کر کسی اسلامی شق کا نفاذ، جیساکہ زکوٰۃ کے سلسلے میں کیا گیا ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگانے والی بات نظر آتی ہے جس سے مخمل کی خوبصورتی ہی گہنائے گی، کوئی لباسِ فاخرہ وجود میں نہ آئیگا، اسلامائزیشن ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ سود کو مارک اپ کہنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

اور اب جب ایک مجاز عدالت نے سود کے غیر اسلامی ہونے اور اسے ختم کرنے کا فیصلہ دیا ہے حکومت ایک مخمصے میں ہے، کبھی سننے میں آتا ہے وہ اس کے خلاف اپیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، کبھی دوسرے ملکوں سے فتوے لینے کی کوشش میں ہے۔ لیکن دنیا کی وہ کون سی اسلامی عدالت ہوگی جو قرآنِ پاک کی واضح ہدایات کے ہوتے ہوئے اس فیصلے سے مختلف فیصلہ دے سکے جو عدالت دے چکی ہے، مذہبی حلقوں کا دباؤ ایک طرف ہے اور معروضی حالات حکومت کے سامنے ہیں۔

آج دنیا بہت چھوٹی ہو چکی ہے، سمٹ چکی ہے، کوئی ملک دوسروں سے کٹ کر الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ آئرن کرٹن، بیمبو کرٹن، سلک کرٹن، سبھی پردے مغرب کی یلغار نے تار تار کر دیئے، کوئی ملک اجنبی جزیرہ بن کر دنیا سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، لین دین، علم و ہنر، سائنس، ہر شعبے میں رابطہ رکھے بغیر دنیا میں پنپنا ممکن ہی نہیں اور پاکستان جیسا ملک جو مغربی استعمار کا ساتھ دے کر مغربی طریقِ معیشت کا اسیر ہے، انہی کے باعث اس کا بند بند قرضوں میں جکڑا ہوا ہے، جن بندھنوں نے اسے جکڑ رکھا ہے وہ لاکھ چاہے بھی ان سے رہا نہیں ہو سکتا۔ یہ قرضے ترقیاتی سکیموں کے نام پر حاصل کئے گئے، ان باہمی معاہدوں میں سود ایک لازمی شق ہے، یہی وہ شق ہے جو دینے والوں کا اصل مقصد تھا، نہ وہ اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ مقروض کو اس سے ہٹنے دے سکتے ہیں ترقی کس کی ہوئی، فائدے میں کون رہا، نقصان کس کا ہوا، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ــــ مگر سود کے اس کاروبار سے قرآنِ پاک کے اس ارشاد کی سچائی نکھر کر سامنے آگئی جس میں کہا گیا ہے:

"ربٰو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت ضُعفٌ یعنی کم کرنا ہے۔" (۳/۱۲۹)

ربٰو سے معاشرے کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کے کمانے کی صلاحیتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اس سے قومی معیشت گھٹتی ہے، بڑھتی نہیں۔ ربٰو سے افراد کے کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور قومی دولت میں کمی آ جاتی ہے ــــ، (نظامِ ربوبیت صفحہ ۴۱۰)

معیشت کا تو جو حال ہوا اس سے قطع نظر اس اَن کمائے باہر کے سرمائے نے اس اسلامی ملک کے سماج پہ جو بُرے اثرات مرتب کئے وہ ظاہر ہیں، انہیں ڈھونڈنے کے لئے اردگرد نظر دوڑا لینا ہی کافی ہے کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں، اگر یہ غیر ملکی امداد نہ ملتی تو کیا ملک ترقی نہ کرتا' (کیا ملک نے واقعی ترقی کی ہے)۔ ہوسکتا ہے کہ ترقی کے یہ مصنوعی مظاہر، اُوپر کے طبقے میں روپے کی ریل پیل، فائیو سٹار ہوٹلوں میں نظر آنے والی مخلوق کے اللے تللے، بڑی بڑی فلک شگاف عمارتیں، نئے مغل بچوں کی وسیع و عریض کوٹھیاں جن کی بیرونی سج دھج جاہ و جلال اور اندرونی آرائش و زیبائش کسی شاہی محل سے کسی صورت کم نہیں ـــ دیکھنے کو نہ ملتے ـــ مگر کیا ترقی اسی کو کہتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو بے بہا خزانے عطا کر رکھے ہیں۔ زمین کے نیچے معدنیات تیل، گیس، پہاڑوں میں قیمتی پتھر یہاں کے سیدھے سادے باشندوں کی سخت محنت جو صدیوں سے زمین کا سینہ چیر کر، شب و روز کی محنت سے فصلیں اُگا کر کروڑوں کا پیٹ پال رہے ہیں، وہ اور ان کی اولاد زمین کے اندر چھپے خزانوں کو تلاش کر کے معیشت کو توانا بنا سکتے تھے؟ فرق صرف اتنا پڑتا کہ اس میں کچھ وقت زیادہ لگتا، کچھ محنت زیادہ کرنی پڑتی، کچھ پسینہ زیادہ بہانا پڑتا ـــ مگر اس کے نتائج اتنے درخشاں ہوتے کہ دنیا کی نگاہیں خیرہ ہوتیں۔

قوم کے تن پر لباسِ فاخرہ نہ ہوتے مگر سر غیروں کے احسانات اور کندھے قرضوں کے بوجھ تلے جُھکے نہ ہوتے، پاکستانی قوم دنیا کی کسی بھی قوم سے برابر کی سطح پر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو چکی ہوتی، اگر کہیں سے امداد لینا بھی پڑتی تو شرائط ہماری ہوتیں، نہ کہ دوسروں کی، ہم دنیا میں خودداری کے ساتھ خود کفالت کی مثال بنتے، غیر ملکی امداد نے، ہماری معیشت کو سود کی لعنت میں مبتلا کر کے اپاہج کر دیا۔ قوم میں تن آسانی اور عیش کوشی در آئی اور جہاں یہ دستور بن جائیں وہاں محنت کی عظمت کو کون پہچانے گا۔ ہر کوئی دوسرے کا حق مار کر، غیر قانونی طریقے اختیار کر کے راتوں رات امیر بننے اور یوں اوپر کے طبقے میں جگہ بنانے کو ہی لائحہ عمل سمجھے گا نتیجہ اس کا یہی رشوت، دھونس، دھاندلی، غنڈہ گردی، ہتھیار بازی، منشیات فروشی، محنت سے فرار اور دیگر اعلیٰ انسانی اقدار سے روگردانی جس کا ہم دن رات رونا روتے ہیں جس دلدل میں روز بروز اور زیادہ گہرے دھنستے چلے جا رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال مدتوں سے چل رہی تھی، ایک طرف سودی نظام، دوسری طرف قرآنِ پاک کا واضح اور کُھلا فیصلہ ـــ فیصلہ کیا، اعلانِ جنگ مگر کسی نے اربابِ اختیار ہوں، یا مذہبی علما اور ان کی درجنوں جماعتیں کسی نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہ دی، حکومتوں کو بدنام کرنے کے لئے مذہب کو ہمیشہ استعمال کیا گیا، مذہبی حلقوں کے

ہاتھ میں پکڑے اس کوڑے کے ڈر سے شرعی عدالتیں کھڑی کی گئیں، شریعت بل لائے گئے اور اب اتفاق سے ایک ایسی ہی عدالت کے فیصلے سے حکومت ایک مشکل گوشے میں پھنس گئی، CORNER ہوگئی ہے۔ حکومت بھی مشکل میں ہے اور قوم بھی، مولوی حضرات شور مچا رہے ہیں مگر ان کی سوچ اور عمل محض شور مچانے تک ہے۔ سب کہتے ہیں سود بند کرو مگر معیشت کن خطوط پر استوار ہو یہ کوئی نہیں بتاتا، دوسری قوموں سے کئے گئے معاہدوں کو ہم کس اصول کے ماتحت یک طرفہ طور پر ختم کر سکتے ہیں، غیر مسلموں کو تو ہم قرآنی آیات پیش کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم توبہ کرو، تمہارے لئے بس راس المال کافی ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیات معاہدوں سے پہلے سے موجود تھیں اس وقت تمہیں ان کا خیال کیوں نہیں آیا۔

اندرونِ ملک بنکوں کا سارا کاروبار سودی ہے، کیا یک قلم سارے بنک بند کر دئے جائیں، ساری رقوم کھاتے داروں کو واپس کر دی جائیں، معاشرہ اسی طرح رہے تو دوسرے ہی دن وہ ساری رقوم چور، ڈاکو، غیر قانونی عناصر چھین، لوٹ کر لے جائیں گے اور ملک کا سارا خزانہ بلکہ اس سے کہیں زیادہ مال و دولت ان کے پاس جمع ہو جائے گا، کیا اس کا کوئی علاج مذہبی جماعتوں کے پاس ہے، رہا سزاؤں کا معاملہ تو یہ تو انتظامیہ کا کام ہے۔ جو انتظامیہ نسبتاً کم مالدار، کم اثر و رسوخ کے حامل ڈاکوؤں کے ہاتھوں بے بس ہے، ان بااثر امیر ڈاکوؤں پہ کیسے قابو پا سکے گی؟ ــــ اور اگر یہ رقوم واپس نہ کی جائیں تو کہاں رکھی جائیں۔

آئندہ کے لئے کیا طریق کار ہو، جو لوگ زائد از ضرورت کماتے ہیں اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بچت کو کیا کریں ــــ اوّل تو سب اُسے کاروبار میں، کارخانے لگانے میں استعمال نہیں کر سکتے، کسی میں یہ قابلیت نہ ہوگی، کسی کو اس میں دلچسپی نہ ہوگی ــــ پھر اُسے کیا جمع کرتے جائیں، کس کے لئے؟ دولت جمع کرنے والوں کے لئے بھی تو سخت عذاب کی آیات ہیں۔ کیا اخراجات بڑھا دیں، مگر یہ اسراف ہوگا، اسراف سے بھی تو منع کیا گیا ہے۔

اگر معاشرہ یہی رہنا ہے، اس میں INFLATION نے یہی کھیل کھیلنا ہے، مہنگائی نے یہی جشن منانے ہیں تو بڑھاپے، بُرے دنوں کے لئے بچائی گئی رقم کی اس وقت جب اس کی ضرورت ہوگی کیا حیثیت ہوگی؟ ۶۰ سے ۷۰، ۷۰ اور ۸۰ اور پھر ۸۰ سے ۸۵ تک کے درمیان بچائے گئے ہر سو روپے کی ۹۲ء میں کیا حیثیت ہے، اس کی قوتِ خرید کیا ہے یہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی، جو بے چارہ محنت کی کمائی پائی پائی کر کے جوڑتا رہا کہ جب بڑھاپے میں کما نہ سکے گا، علاج معالجے یا کوئی اور مہنگائی ضرورت پڑ گئی تو کام آئے گا، اس بچت کی بے بضاعتی پہ کس کو پکارے گا، کس پہ امید باندھے گا،

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

سود ضرور ختم کرو مگر اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی تو بتاؤ۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلامی معاشی نظام کیا ہے ـــــ یہ جو اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہاں کوئی بھوکا ننگا اور بغیر چھت کے نہ ہوگا، ہر ایک کو تعلیم، علاج میسر ہوگا، کوئی معذوری اور بڑھاپے میں بے سہارا تنہا اور مجبور نہ ہوگا ـــــ وہاں نہ خوف ہوگا نہ حزن ـــــ جہاں مکمل امن و امان ہوگا، جس کی مثال اکثر یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ وہاں ایک تنہا جوان عورت زیورات سے لدی، ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کر سکے اور اُسے (سوائے خدا کے) کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

اتنی ساری ذمہ داریاں کوئی ملک کیسے پوری کر سکتا ہے، اس کا ریونیو کہاں سے آئے گا، پھر وہی بات کہ اس کا معاشی نظام کیا ہوگا، اس کا سیاسی نظام کیا ہوگا کہ اس میں ایسے لوگ سربرآرائے تخت اقتدار ہوں گے کہ عدل و انصاف ان کا شیوہ ہو ـــــ آسمان سے فرشتے تو نہ اُتریں گے، یہ سب کیسے ہوگا، یہ بتانا، اس کی راہ سجھانا ان کے بس کی بات نہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ کہہ چکے ہیں۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

کیا کسی جمعیت، کسی جماعت، کسی سیاسی گروہ، کسی اسلامی قیادت نے متبادل معیشت کا نقشہ تیار کر رکھا ہے جو سود سے یکسر پاک ہو اور جس کے پاس اتنا سرمایہ ہو کہ بڑے بڑے قومی ترقیاتی منصوبوں پہ کام ہو سکے، جو مملکت میں بسنے والے تمام لوگوں کے رزق کی ذمہ داری بھی اٹھائے ـــــ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسلامی مملکت ببانگِ دہل اعلان کرتی ہے کہ

نحن نرزقکم و ایاھم

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔

یقیناً کسی گروپ، کسی پارٹی کے پاس ایسا کوئی مسودہ، کوئی نقشہ موجود نہیں ورنہ وہ کب کے اسے لوگوں کے سامنے لا چکے ہوتے،

ہاں نظامِ ربوبیت کے علمبردار اس کا حل پیش کرتے ہیں، اپنی کتاب نظامِ ربوبیت میں سود کے عنوان کے تحت پرویزؒ صاحب صفحہ ۴۱۳، ۴۱۴ میں فرماتے ہیں،

"قرآنِ کریم کی رُو سے ربوٰ کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، اس میں جو دشواریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربوٰ کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری مروّجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت یعنی کاروبار

میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جا سکے وغیرہ۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے، اس لئے وہ ربٰو کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے، بجائے اس کے ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدل لیں چاہتے ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا، قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے، اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔"

قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے،

(ا) زمین ذریعۂ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا، پانی، روشنی کی طرح) نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے، اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ اُمّت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے ــــ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو، اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی، اس لئے افراد کے لئے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ INVEST کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے، اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑتا لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ربٰو سود کا نام نہیں، یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرکے، کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے، غیر قرآنی نظام میں ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔"

بجا، درست، بالکل درست، سو فی صد درست، یہ تو ہوئی اصولی رہنمائی، مفکرِ اصولی رہنمائی ہی دیا کرتا ہے

تفصیل وقت کے تقاضوں کے مطابق مرتب کی جاتی ہے ـــــ آج کے حالات آپ کے سامنے ہیں، زمین جو ذریعۂ رزق ہے اس وقت خدا کی نہیں دیہہ خداؤں کی ملکیت ہے اور وہ کسی صورت اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، یہی تو ان کے اقتدار کی چابی ہے ـــــ

یہ جمہوریت کا دور ہے، سوویت پرولتاری ڈکٹیٹرشپ دم توڑ چکی ہے، امریکہ بہادر اس وقت ہمہ مقتدر سپر پاور ہے، اس وقت بزعمِ خود دنیا بھر میں جمہوریت رائج کرنے کا ٹھیکہ اس نے اپنے اوپر لے رکھا ہے، وہ الجزائر، لیبیا، ایران، پاکستان بلکہ چین تک کو جمہوریت کا درس دے رہا ہے، اس جمہوری دور میں یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ جمہوریت کے عمل سے کوئی ایسی اسمبلی وجود میں آسکتی ہے جو جاگیرداروں، زمینداروں وڈیروں، سرداروں اور خوانین کو کہہ سکے،

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیرے آبا کی نہیں

جو پادشاہوں کو چیلنج دے،

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اوّل تو یہ معجزہ رونما ہو نہیں سکتا اور اگر یہ کسی طرح کسی حد تک ہی سہی ممکن ہو بھی جائے تو زمین اور زمین میں چھپے خزانے مملکت کے نہیں، اُمّت کے نہیں، بیوروکریسی کی تحویل میں آجائیں گے جیسے قومیانے کے نام پر ہوا اور اس کا جو انجام روس اور خود اپنے ملک میں ہوا اُسے دیکھتے ہوئے اور بیوروکریسی کی ٹریننگ اور کردار کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مختلف انجام ہو بھی نہیں سکتا تھا اگر پھر ایسا کیا گیا تو اس کا انجام پھر ایسا ہی ہوگا، بلکہ ناکام تجربے کو دہرانے کا انجام بدتر ہی ہوگا، روس کا جو حشر ہوا ہے وہ بھی اسی بیوروکریسی کا کیا دھرا ہے جس کے پاس کوئی اخلاقی ضابطۂ حیات نہ تھا۔

غیر سودی نظام کی جو اہم خصوصیات ہم نے گنوائیں ان سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اس کی روح وہی اشتراکی اشتمالی ہے، اس میں ملکیت نہیں، تحویل ہے ذرائع پیداوار پر ساری کی ساری امّت کی اور جذبۂ محرکہ اسلام کا وہ فلسفہ ہے جو آخرت پر ایمان پر مبنی ہے اور یومِ مکافات پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی وحدت اور آخرت کے فلسفے پر یقین رکھے بغیر اپنی محنت کی کمائی کو دوسروں کو دینے کا جذبۂ محرکہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

مگر ایسا ممکن کیونکر ہوگا، شبا شب آپ انسانوں کے خیالات کو تبدیل نہیں کر سکتے، زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے، غفلت کا ایک لمحہ سوئے ہوؤں کو صدیوں پیچھے چھوڑ جائے گا، پھر بھی منزل کی طرف بڑھنا تو قدم بقدم ہی ہوگا۔

اس دور میں، جب سویت یونین کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے، لینن کے مجسمے توڑ دیئے گئے ہیں، مارکس

کا نام ملک بدر ہو چکا ہے، اشتراکیت کا نام ممنوع ہے، جمہوریت سکۂ رائج الوقت ہے، سب سے پہلے تو ملکی حالات کے مطابق جمہوریت کو ڈھالنا ہوگا، دنیا میں اس وقت مختلف ملکوں میں جمہوریت کی مختلف شکلیں ہیں، امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں الیکشن کی ایک شکل نہیں، ایک انداز نہیں، تاہم سب خود کو جمہوری ملک کہتے ہیں، ہمارے جیسے ایشیائی ملکوں میں ضروری نہیں کہ جمہوری عمل کی وہی صورت ہو جو امریکہ یا برطانیہ، جرمنی یا فرانس میں ہے ـــــ برطانوی جمہوری عمل نے ہمیں جو اسمبلیاں دی ہیں وہ ہماری آبادی کی نمائندگی نہیں کرتیں ـــــ دیکھ لیجئے اسمبلیوں کے سینکڑوں نمائندوں میں نچلے طبقے کے نمائندے کتنے ہیں، درمیانے طبقے کے کتنے اور اوپر کے طبقے کے کتنے، کیا یہ نمائندگی ان طبقوں کے آبادی میں تناسب کے مطابق ہے ـــــ اس وقت اسمبلیوں میں ننانوے فیصد وہ لوگ ہیں جو الیکشن میں اتنے روپے خرچ کر کے پہنچے ہیں کہ نچلے تو کیا درمیانے طبقے کے کسی شخص کے تصور میں بھی نہیں آ سکتے، عملاً ساری کی ساری نمائندگی اوپر کے طبقے کے پاس ہے، وہی اسمبلیوں میں ہیں، وہی وزیر ہیں، سول اور فوج میں بھی اونچے عہدوں پر اسی طبقہ کی اجارہ داری ہے، اب تو یہ طبقے باہمی رشتوں کے بندھنوں میں بندھ کر ایک وسیع خاندان کی شکل اختیار کر چکے ہیں، اس طرح یہ اجارہ داریاں خاندانی اجارہ داریوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں اور ملک عملاً چند خاندانوں کا غلام بن چکا ہے، اس طرزِ انتخاب میں تو یہی لوگ اوپر آئیں گے اور اسمبلیاں انہی کے مفادات کی نگہبان رہیں گی۔

ضرورت ہے کہ اسمبلیوں میں طبقات کے مطابق نمائندگی ہو، جب کم از کم ۸۵ فیصد ممبر غریب طبقے سے ہوں گے، ۱۰ فیصد درمیانے طبقے سے اور پانچ فیصد اوپر کے طبقے سے ـــــ اس طرح اسمبلیوں سے اوپر کے طبقے کی اجارہ داری ختم ہوگی اور اسمبلیاں زیادہ نمائندہ اسمبلیاں ہوں گی، یہ اسمبلیاں نچلے طبقات کے حقوق کی نگہبانی کر سکیں گی، انہی کے طفیل معیاری تعلیم کی سہولتیں غریب طبقات تک پہنچ سکیں گی، ان کی علمی سطح بلند اور ذہنی افق وسیع تر ہوگا، ان کی مضمر صلاحیتیں ابھر کر سطح پر آ سکیں گی، ان صلاحیتوں کے بل پر قومی دولت بڑھے گی۔

کبھی آپ نے اس بات پہ غور کیا کہ قومی سطح پر ہماری کتنی 'RESOURCES UNTAPPED' پڑی ہیں۔ مادی ریسورسز کے علاوہ ذہنی صلاحیتوں کا معاملہ بھی توجہ کے قابل ہے، ۸۰ فیصد بچے جو سکول تک نہیں پہنچ پاتے کیا ان کو اللہ تعالیٰ نے دماغ نہیں دے رکھے، کیا ان کے اندر بے انتہا مضمر صلاحیتیں نہیں جنھیں تعلیم کے ذریعے اگر بروئے کار آنے کا موقع دیا جائے تو وہ قومی دولت کو بڑھانے میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ قدرت نے ساری صلاحیتیں صرف اس وقت کے برسرِ اقتدار طبقے اور اس کی اولاد کے لئے تو مختص نہیں کر رکھیں، ان طبقوں کا قبضہ تو محض غاصبانہ قبضہ ہے۔

عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے، کوئی حکومت تعلیم کا پورا خرچہ نہیں اٹھا سکتی، کوئی حکومت علاج معالجے کا سارا خرچہ

نہیں اُٹھا سکتی، مخیر، مالدار حضرات کو تعاون کے لئے آگے آنا چاہیئے ـــــ اور پھر یورپ اور امریکہ کی مثالیں دی جاتی ہیں، فورڈ فاؤنڈیشن اور ایسے دوسرے اداروں کی بات کی جاتی ہے ـــــ

یہ ادارے سرمایہ دار ملکوں میں سرمایہ دار حکومتوں کے قوانین میں ٹیکسوں کی رعایت کے لئے فلاحی کام کرتی ہیں، کسی اور نیک جذبے کے تحت نہیں، بالکل ایسے ہی جیسے تجارتی ادارے اشتہار باز کمپنیوں کو خوبصورت قسم کے اشتہاروں کے لئے خطیر رقوم دے کر انہیں اخراجات دکھا کر آمدنی میں سے کاٹ کر رعائتیں لیتے ہیں اور پھر یہ تمام اخراجات اپنی پروڈکٹس میں جمع کر کے ان کی قیمتیں بڑھا لیتے ہیں۔

کیا اسلامی معاشی نظام میں بھی یہی کچھ ہوگا، وہ نحن نرزقکم جیسی ذمہ داریاں اسی طرح کی بیساکھیوں کے سہارے پوری کرے گا، اسے بھی سرمایہ داروں کے سہارے ڈھونڈنے پڑیں گے۔

زرعی اصلاحات پہلے بھی ہوئیں، اگر ان پر صدقِ دل سے عمل کیا جاتا تو حالات بہتر ہوتے، عمل اسی لئے نہ ہو سکا کہ قانون پاس کرنے والے بھی زمیندار تھے، عمل پیرا ہونے والی انتظامیہ انہی کے زیرِ اثر اور خود اس پہ یقین نہ رکھنے والی، انہی کے اشاروں پہ، انہی کے مفادات کی نگہبانی کرنے والی تھی ـــــ اور پھر ان کی رشتہ داریوں کی طرف میں پہلے ہی نشاندہی کر چکا ہوں۔ ہاں اگر طبقاتی نمائندگی والی اسمبلی ایسی اصلاحات کرے اور ان کو منطقی انجام تک پہنچائے تو رفتہ رفتہ زمین ہل چلانے والوں کے ہاتھوں منتقل ہو جائے گی، تعلیم ـــــ ایک نظریاتی مملکت میں ایک منزل کی طرف چلاتی ہے، تربیت خاص قسم کے انسان بناتی ہے ـــــ ہاری اور کسان اب بھی زمین کے مالک نہیں، کل جب زمین زمیندار کے ہاتھوں میں نہیں ہوگی، کسان اور ہاری کو یہ سمجھانا کہ زمین پیداوار دینے کے لئے ہے، ملکیت کے لئے نہیں، یہ تمہاری ضروریات پوری کرے گی، جو بچے گا وہ اُن کا ہوگا جن کو اس کی ضرورت ہے، ملک کی ہر چیز امت کے ہر فرد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے ـــــ مالک تو ہر چیز کا اللہ ہے، زمین انسان کی پیدائش سے پہلے سے موجود ہے، پانی، ہوا، سورج کی طرح اللہ کی طرف سے سب انسانوں کے لئے یکساں، ـــــ انتظام وانصرام کے لئے امت جن لوگوں کو چنے گی وہ ایسے ہی امین ہوں گے کہ کسی سے بے انصافی، کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، ہر ایک کو اس کی قابلیت کے مطابق کام ملے گا، ہر ایک اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرے گا، کمائے گا، اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی سب امت کے حوالے کر دے گا جس سے اتنی RESOURCES اتنا ریونیو آئے گا کہ سنبھالے نہ سنبھلے گا، ترقیاتی کام جو غیر ملکی سرمائے کے بل پہ اربوں میں ہوتے ہیں کروڑوں میں تکمیل پذیر ہوں گے، کروڑوں کے کام لاکھوں میں کیونکہ ان میں کِک بیک، رشوت، کمیشن کچھ بھی نہ ہوگا ـــــ سالوں میں تکمیل پانے والے کام مہینوں میں ہوں گے کیونکہ ہر کوئی اپنی پوری پوری توانائیاں کام میں صرف کر رہا ہوگا ـــــ کسی ریٹرن کے لئے نہیں بلکہ اس یقین پہ کہ وہ انسانیت کی بھلائی کے لئے اعمالِ صالحہ میں مصروف ہے جس کا بدلہ اسے اس دنیا کے علاوہ آخرت میں

بھی ملے گا۔ وہ اسلامی اقدار کے تقویٰ شعار لوگ ہوں گے جو خود خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتے ہیں۔

یہ کام بتدریج، مرحلہ در مرحلہ، ایک اسکیم کے مطابق انجام پانا چاہیئے، فساد اور خلفشار کچھ تعمیر نہیں کر سکتا۔ فساد انقلاب نہیں ہوتا۔ دنیا میں آنے والے انقلابات میں نبی کریمؐ والذین معہٗ کے ہاتھوں لایا گیا انقلاب ہی انقلاب تھا، قلب کی وہ تبدیلی جو انسانوں کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان کے ہاتھوں معجزات برپا کر دیتی ہے۔ باقی تبدیلیاں جنہیں دنیا انقلاب کہتی ہے فساد تھے، اسی لئے اپنے منطقی انجام کو پہنچے، ناکام ہوئے۔

(ہمارا ملک تنہا ایسا ملک ہے جو ایک نظریئے کے ماتحت وجود میں آیا۔ دو قومی نظریہ دراصل اسلام ہی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی کہ اسلام میں یقین رکھنے والے ایک قوم ہیں اور نہ رکھنے والے دوسری قوم، اب اسلام صرف عبادات کا نام نہیں، صرف سزاؤں کا نام نہیں، اسلام کا اپنا معاشی نظام ہے، وہ ایک منفرد دنیا میں موجود دوسرے معاشروں سے یکسر مختلف معاشرہ تشکیل دیتا ہے، کسی دوسرے نظام میں پیوند لگانے سے یہ وجود میں نہیں آسکتا، سود کو مارک اپ کہنے سے بات نہیں بنے گی، کسی بھی دوسرے نظام کی کانٹ چھانٹ سے اسلامی نظام نہیں بن سکتا، اسلامائزیشن ایک بے معنی اور دھوکا دینے والی اصطلاح ہے، کوئی چیز اسلامی ہے یا غیر اسلامی، کسی غیر اسلامی شے کو برقعہ پہنا کر اسلامی نہیں بنایا جا سکتا، اس کی روح کو بدلنا پڑے گا۔ اس میں زمین اور سارے وسائل رزق اُمت کی تحویل میں ہوتے ہیں، کسی انسان کی، کسی حکومت کی ملکیت نہیں ہوتے، ان وسائل کو بروئے کار لانے والے جن لوگوں کو اُمت منتخب کرتی ہے وہ اسلامی اقدار کے حامل تقویٰ شعار لوگ ہوتے ہیں جو خود کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں۔ اور تمام اُمت کو ساری بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔)

ابھی سے ان کا کوئی نام لیوا نظر نہیں آتا مگر انقلاب نبویؐ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی دلوں کو گرماتا اور ہمتوں کو مہمیز دیتا ہے اور دیتا رہے گا۔ اس کے برپا کرنے کے لئے وقت کے تقاضوں کے مطابق جمہوری راستہ ڈھونڈنا پڑیگا۔ کتاب و حکمت۔ تعلیم و تربیت کے سہارے وہ لوگ سامنے لانے ہوں گے جو اس کام کا بیڑہ اٹھائیں۔

Gentlemen !

Should you be interested to know about Tolu-e-Islam Movement, please feel free to write to the Nazim, Idara Tolu-e-Islam, 25B Gulberg II, Lahore, Pakistan or dial 92-42-879246.

The Editor

قرآنی وصیّت

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ راقم نے وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد میں محمڈن لاء کی دفعہ ۱۱۷ اور ۱۱۸ کو اس بنا پر چیلنج کیا تھا کہ محمڈن لاء کی تدوین اور تصنیف ایک غیر مسلم کے ہاتھوں ہوئی ہے اس لئے قانونِ وصیت کی مندرجہ بالا دونوں دفعات کو قرآنِ کریم کی آیات کو سامنے رکھ کر اسلامی قرار دی جائیں اور دونوں دفعات کو خارج از اسلام یعنی خلافِ قرآن قرار دیا جائے۔ ابتدائی سماعت کے بعد باقاعدہ سماعت کے لئے درخواست منظور ہوئی اور تین جج صاحبان جناب چیف جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، جناب جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خاں اور جسٹس نذیر احمد بھٹی پر مشتمل بنچ نے مورخہ ۲۰/۲/۹۲ کو درج ذیل فیصلہ کر کے درخواستِ سائل خارج کر دی۔ سائل نے سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ بنچ میں اپیل دائر کر دی ہے، جو آپ کے سامنے ہے۔

JUDGMENT

Dr. Tanzil-Ur-Rahman, Chief Justice:-
By this petition, the petitioner has challenged paragraphs No. 117 and 118 of Muhammadan Law as repugnant to the injunctions of the Holy Quran and Sunnah of the Holy Prophet (peace be upon him). The said two paragraphs are reproduced as under:-

117. Bequests to heirs:- A bequest to an heir is not valid unless the other heirs consent to the bequest after the death of the testator. Any single heir may consent so as to bind his own share.

Explanation:- In determining whether a person is or is not an heir, regard is to be had, not to the time of the execution of the will, but to the time of the testator's death.

118 Limit of testamentary Power:- A Muhammadan court by will dispose of more than a third of the surplus of his estate after payment of funeral expenses and debts. Bequests in excess of the legal third cannot take effect, unless the heirs consent thereto after the death of the testator.

2. The above two paragraphs relate to the law of wills, which undoubtedly fall within the ambit of Muslim Personal law.

3. In view of the express bar on this court to examine Muslim Personal Law as provided under Article 203 B(c) of the constitution, the petition is dismissed for want of jurisdiction.

sd/ Dr. Tanzil-Ur-FRahman C.J.
sd/ Dr. Fida Muhamnmnad Khan J.
sd/ Nazir Ahmed Bhatti J.

بعدالتِ عظمیٰ پاکستان (شریعت اپیلیٹ بنچ) راولپنڈی

حسبۃ اللہ ثانی اپیلانٹ

بنام

فیڈریشن آف پاکستان بذریعہ سیکرٹری محکمہ قانون وانصاف پاکستان اسلام آباد رسپانڈنٹ

اپیل زیر آرٹیکل F ۔ 203 آئین پاکستان ۱۹۷۳ء

برخلاف حکم و فیصلہ فیڈرل شریعت کورٹ پاکستان مصدرہ ۲۰-۲-۹۲

جس کی رُو سے اپیلانٹ کی شریعت پٹیشن نمبر I / 13 آف ۱۹۹۰ء مسترد

ہوئی۔

استدعا:۔ منظوری اپیل ہٰذا منسوخی حکم فیڈرل شریعت کورٹ و قرار دئے جانے کہ دفعات ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۸ مندرجہ محمڈن لاء (دربارۂ وصیت) تعلیماتِ قرآن و احکام خداوندی کے یکسر خلاف، قابلِ تنسیخ فلہٰذا ناقابلِ عمل ہیں۔

مزید یہ کہ از رُوئے قرآنِ کریم وصیت کنندہ پر ۱/۳ سے زائد وصیت کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہے اور اگر کسی شخصی قانون میں ایسی قدغن ہے تو وہ قرآن کریم کی نصِ صریح کے خلاف لہٰذا خلافِ اسلام ہے۔

جنابِ عالی!

اپیلانٹ حسبِ ذیل عرض رساں ہے۔

۱۔ یہ کہ اپیلانٹ نے وفاقی شرعی عدالت میں ایک درخواست گزاری جس میں محمڈن لاء جس کے مصنف سر ڈی ایف مُلا ہیں، کی دفعات ۱۱۷، ۱۱۸ کو خلافِ قرآن یعنی اسلام قرار دینے کی استدعا کی گئی۔

(مصدقہ نقل درخواست لف ہے)

۲۔ یہ کہ فاضل عدالت نے ابتدائی سماعت کے بعد باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کی اور بعد ازاں وفاقی شرعی عدالت نے درخواست اپیلانٹ خارج کردی۔ (مصدقہ فیصلہ لف ہے)

۳۔ یہ کہ فاضل عدالت کا فیصلہ خلافِ واقعات و روداد نصِ قرآنی ہے۔

۴۔ یہ کہ اپیلانٹ ایک راسخ العقیدہ مسلم ہے اور قرآنِ کریم کو منجانب اللہ بنی نوع انسان کے نام آخری پیغام اور سرچشمۂ قوانین و ہدایت ایمانِ محکم کی حد تک سمجھتا ہے اور اس کتابِ عظیم کا طالب علم ہونے کے ناطے اس کو مکمل طور پر منزل من اللہ سمجھتے ہوئے اس عقیدہ کا حامل ہے کہ

ا۔ وصیت فرض ہے۔ (۲/۱۸۰)۔ قرآنِ کریم سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۸۰۔
ب:۔ وصیت کا طریقہ کار اور جزئیات تک بھی بتا دی گئی ہیں۔ (۵/۱۰۶) سورۃ مائدہ آیت نمبر ۱۰۶۔
ج:۔ وصیت کو ترکہ کی تقسیم پر مقدم رکھا گیا ہے جب کہ قرض بھی اس کے بعد آتا ہے۔
د:۔ اللہ تعالیٰ نے وصی کو مکمل اختیار دیا ہے۔ نیز یہ کہ وصیت کسی کے حق میں بھی کی جا سکتی ہے۔
ل:۔ یہاں تک کہ بیویوں کے حق میں بھی وصیت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (۲/۲۴۰)

۵۔ یہ کہ اپیلانٹ احکامِ قرآن کو مدنظر رکھ کر وصیت کرنا چاہتا ہے لیکن محمڈن لاء کی دفعات ۱۱۷، ۱۱۸ کی رُو سے اپیلانٹ ۱/۳ حصہ سے زائد وصیت کرنے سے قاصر ہے۔ چونکہ محمڈن لاء کی تدوین ایک غیر مسلم کے ہاتھوں ہوئی ہے اس طرح قرآنِ کریم کی آیات کو نہ سمجھتے ہوئے غلط طور پر ایک پابندی لگا دی گئی ہے۔ مزید برآں وارث کے حق میں بھی ۱/۳ سے زائد وصیت نہیں کی جا سکتی جب تمام ورثا رضامندی کا اظہار نہ کریں۔

۶۔ یہ کہ اپیلانٹ ایسے قوانین جو خلافِ قرآن ہوں اسے چھپا کر رکھنا خلافِ شریعت سمجھتا ہے جیسا کہ حکم ہے۔
ترجمہ:۔ "جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں دراں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

(۲/۱۵۹)

بدیں وجہ اپیلانٹ نے فیڈرل شریعت کورٹ میں درخواست بمراد مذکورہ استدعا گزاری جو کہ عدالت ماتحت نے بوجہ ذیل خارج کی کہ

"آئین کی دفعہ (c) 203 B کے تحت مسلم پرسنل لاء کو عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھا گیا ہے اور عدالت کو اختیارِ سماعت حاصل نہ ہے۔"

اس طرح عملی طور پر آئینِ پاکستان کی دفعہ (c) 203 B کا درجہ قرآنِ کریم کی واضح آیت کے باوجود برتر و اعلیٰ ہے اور بالفاظِ دیگر شخصی قوانین کے سامنے (معاذ اللہ) قرآنِ کریم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس طرح قرآنِ کریم کے واضح حکم کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا کہ آئین کی رُو سے قرآنی احکامات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ آئین میں شخصی قوانین کو محض انتظامی اور سیاسی نقطۂ نظر سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جس کے عوامل بعض اوقات حکومت کے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جبکہ آج کے دور میں اسلامی شخصی قوانین کو بھی عدالتِ عظمیٰ اجماع کے نکتہ نظر سے پرکھ سکتی ہے۔

۷۔ یہ کہ فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ خلافِ قرآنِ کریم مزید بدلائل ذیل بھی قابلِ منسوخی ہے۔

ا۔ قانونِ وصیت منزل من اللہ ہے۔ جس کی تعمیل یا جس پر عمل درآمد ہر مسلم (مسلمان) کا فریضہ ہے۔ لہٰذا یہ کسی طور بھی مسلم پرسنل لاء کے زمرہ میں نہیں آسکتا۔ مسلم پرسنل لاء دراصل وہ شخصی قانون ہے جو چاہے تو اس پر عمل کرے اور چاہے تو اُسے چھوڑ دے یا جس میں فرد کو اختیار حاصل ہو کہ وہ ایسے قانون کو اختیار کرے یا اس سے اعراض برتے جس میں اُسے اپنا مفاد نظر آئے، کیونکہ اس کے لئے کسی انسانی وضع کردہ فقہ کا پیروکار ہونا ضروری ہے جب کہ قانونِ وصیت صریحاً فرض قرار دیا گیا ہے اور مسلم معاشرہ یا مسلم حکومتِ وقت پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے اور یہی فرض عدالت پر بھی عائد ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کے ایسے واضح قانون/قوانین کو من وعن افراد پر نافذ کرے یا کروائے۔

۸۔ یہ کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے بلاتشریح کئے ہوئے درخواست سائل کو مسلم پرسنل لاء کہہ کر درخواست بڑی آسانی سے فیصلہ کر کے چھٹکارا حاصل کیا اور مسلم پرسنل لاء کے پسِ منظر میں موجود عوامل پر کوئی غور نہیں کیا۔ حالانکہ نزاع کسی طور پر مسلم پرسنل لاء کی تعریف میں نہیں آتا۔

۹۔ یہ کہ جیسا کہ قانونِ زکوٰۃ وعشر کو بھی مسلم پرسنل لاء کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور جس پر بزورِ عمل درآمد بھی کیا جا رہا ہے اور اس طرح قانونِ زکوٰۃ وعشر علیحدہ علیحدہ فقہوں کے ساتھ منسلک ہونے کی بنا پر مسلم پرسنل لاء قرار دے دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں کوئی بھی مسلمان اگر پانچ روپے کے اسٹامپ پر بیانِ حلفی دے کر اپنی فقہ تبدیل کر دے تو اس شخص سے بنکوں، یا مالیاتی اداروں میں زکوٰۃ نہیں کاٹی جاتی۔ اور اس طرح فقہ تبدیل کرنے سے مسلم پرسنل لاء کو بھی اپنے مفادات کے پیشِ نظر تبدیل کیا جا سکتا ہے۔
لیکن وصیت کی صورت اس سے مختلف ہے بلکہ فرضیت کے اعتبار سے صوم اور صلوٰۃ کی طرح فرض قرار دی گئی ہے اس لئے اس کا اطلاق تمام مسلمین (مسلمانوں) پر ہوگا۔

۱۰۔ یہ کہ اپیل اس لئے کی جا رہی ہے کہ فیصلہ قرآنِ کریم کے واضح احکامات کی روشنی میں صادر کر کے ایک غلط قانون جو کہ یکسر خلافِ قرآن ہے کو منسوخ فرمایا جاوے اور قرآنی قانونِ وصیت پر انسانی قدغن ختم کی جاوے۔

۱۱۔ یہ کہ بابت قانونِ وصیت کسی بھی فرقہ کی فقہ کا نفاذ انسانی قوانین کا نفاذ ہوگا جس میں کوئی نہ کوئی جذبہ محرکہ یا انسانی جذبات کارفرما ہوں گے جو کہ قرآن کی نظر میں صریحاً شرک ہے۔ (۳۲-۳۱/۳۰)۔ قرآنی قانون انسانی جذبات سے مبرا ہے اور انسانیت کے لئے ہے۔

۱۲۔ یہ کہ مذکورہ بالا دفعہ آئینِ پاکستان کی رُو سے عدالتِ عظمیٰ کو اختیارِ سماعت حاصل ہے کہ کوئی بھی قانونِ مروجہ جو قرآن وسنت کے خلاف ہو اسے کالعدم قرار دے۔ مروجہ ۳/۱ حصہ کی قدغن شریعت نہیں ہے۔ لہٰذا جو قرآن

میں نہیں اسے شریعت بنا دینے والے خدا کے شریک ہیں۔ (۴۲/۲۱) سورۂ شوریٰ۔

۱۳ یہ کہ محمڈن لاء اس لئے بھی مسلم پرسنل لاء کے تحت نہیں آتا کہ اس کی تدوین ایک غیر مسلم نے کی ہے جو قرآنِ کریم کی حقیقت اور احکامات سے یکسر نابلد تھا۔ ایسا کسی سازش کے تحت کیا گیا ہے۔

۱۴ یہ کہ محمڈن لاء میں موجود دفعات ۲،۱۹ کے تحت کسی محمڈن کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ کوئی بھی شخص جو محمدی مذہب کا عقیدہ رکھتا ہو یعنی وہ یہ تسلیم کرتا ہو کہ

(ا) ایک خدا ہے اور

(۲) کہ محمدؐ اس کا پیغمبر ہے، وہ محمڈن کہلائے گا۔

(ا) ایسا شخص پیدائشی طور پر بھی محمڈن ہو سکتا ہے یا مذہب تبدیل کرنے سے بھی محمڈن ہو سکتا ہے۔

(ب) اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اسے مخصوص رسم و رواج پر پابند رہنا چاہیئے یا وہ اس مذہب میں راسخ العقیدہ ہو، کوئی بھی عدالت مذہب کے ساتھ اس کی وابستگی یا مذہبی عقائد کو نہ تو ناپ سکتی ہے (پیمانہ کر سکتی ہے) اور نہ ہی اسے آزمایا جا سکتا ہے۔

(ج) اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ محمدی مذہب پر عقیدہ رکھتا ہو اس لحاظ سے کہ وہ ایک خدا اور محمدؐ کی پیغمبرانہ خصوصیت کو تسلیم کرتا ہو۔

۱۵ یہ کہ مندرجہ بالا تعریف کسی مسلم پرسنل لاء کو ماننے والے کی تو ہو سکتی ہے لیکن قرآنِ کریم پر یقین محکم رکھنے والے کی ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ جزاف کے حساب سے دنیا کی آدھی بلکہ پونی آبادی سے زیادہ آبادی ایک خدا کو تسلیم کرتی ہے لہٰذا وہ لوگ محمڈن کہلانے کے مستحق ہیں۔

۱۶ یہ کہ خود کوئی مسلم کسی صورت میں بھی محمڈن نہیں کہلایا جا سکتا؛ یہ اصطلاح سرے سے غیر قرآنی لہٰذا غیر اسلامی ہے کہ محمدؐ خود سب سے پہلے مسلم تھے، اس لئے ایسی دفعات یکسر تعلیماتِ قرآنِ کریم کے خلاف ہیں اور ایسا ایک سازش کے تحت کیا گیا ہے جس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

۱۷ یہ کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ پرسنل لاء کی اصطلاح بھی خود انسان کی وضع کردہ ہے جو کہ قرآنِ کریم کی آیت نمبر ۲/۸۵ کے یکسر خلاف ہے کہ

مفہوم:۔ "تم ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو (حالانکہ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے اسی طرح اس ضابطۂ خداوندی کو بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار کیا جائے گا۔ جس طرح جسم کے

دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح جو قوم ضابطۂ خداوندی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور جو حصّہ مفید مطلب ہو اُس پر عمل کرتی ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتی ہے، تو) اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی قوم کے حال کی زندگی بھی ذلّت اور رسوائی کی زندگی ہو اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہی سے لبریز۔ دنیا میں بھی ذلّت اور آخرت میں بھی رسوائی۔

ضابطۂ خداوندی سے اس قسم کا برتاؤ کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

۱۸۔ یہ کہ عدالت ہذا کو ایک بار مسلم پرسنل لاء کی وضاحت بالصراحت کر دینی چاہیئے کہ آیا مسلمان چاہیں تو اس پر عمل کریں اور چاہے تو نہ کریں یا انہیں مجموعی طور پر کرنا چاہیئے یا مجموعی طور پر انکار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جتنی بھی فقہیں اس وقت میدان میں موجود ہیں سب کی سب حضور صلعم کے بعد کی وضع کردہ ہیں اور محض قدیم ہونے کی وجہ سے تقدّس اختیار کر گئی ہیں اور یا ہمیں ان کا پابند بنایا جا سکتا ہے اور کیا مندرجہ بالا آیت اس حقیقت کی عکاس نہ ہے۔

۱۹۔ یہ کہ فیصلہ قرآنِ کریم کی آیت نمبر ۴۷، ۴۵، ۵/۴۴ کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ـــــ
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ـــــ
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ـــــ کی روشنی میں فرمایا جاوے۔

لہٰذا استدعا ہے کہ بمنظوری اپیل ہذا محمڈن لاء کی دفعات ۱۱۷، ۱۱۸ کو قرآنِ کریم کے واضح احکامات کے تحت خلافِ احکام قرآنِ کریم قرار دیا جائے۔

المرقوم ۹۲-۵-۱۰

اپیلانٹ عبداللہ ثانی بوکالت خود۔

مورخہ ۹ اپریل ۱۹۹۲ء، ڈان ماڈل سکول کے افتتاح کے موقع پر
ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب، چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا

خطاب

(حاضرین میں طلوعِ اسلام کنونشن کے مندوبین بھی شامل تھے)

معزز خواتین و حضرات السلام علیکم! آپ کی تشریف آوری کا شکریہ!

آپ کو معلوم ہے کہ محترم پرویز مرحوم کا علومِ قرآنی کی اشاعت و ترویج کے سلسلے میں آخری اور بلند مقصد ایک ایسی درسگاہ کا قیام تھا جس میں طالب علموں کو اس قابل بنانا مقصود تھا کہ وہ دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکیں۔ اس درسگاہ میں مضامین کو اس طرز سے پڑھانا مقصودِ نظر تھا کہ طلباء کو ساتھ ہی ساتھ یہ معلوم ہوتا جائے کہ اس میں کونسی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور قرآنِ کریم کا اس بات میں نقطۂ نظر کیا ہے — علاوہ ازیں انھیں قرآنِ کریم کی تعلیم اس طرز پر دی جانی مقصود تھی کہ جو مسائل وقتاً فوقتاً سامنے آئیں، طالب علم یہ بتا سکیں کہ اس بات میں قرآنِ کریم ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے؟ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے؟ وہ کون سی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت اُٹھ گیا ہے؟ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل ان کو نہیں مل رہا اور جس کی وجہ سے امنِ عالم خطرے میں پڑ رہا ہے، قرآنِ کریم ان مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے؟

اِن مقاصد کے حصول کے لئے آج سے ٹھیک ۲۷ برس پیشتر ۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کے دن قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹر کروائی گئی تھی۔ اس وقت سوسائٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی ۷ ممبران پر مشتمل تھی جن میں سے آج صرف دو ممبران، میں خود اور محترم شمیم انور صاحبہ موجود ہیں۔ اب گذشتہ سال سے سوسائٹی کی جنرل باڈی نئے سرے سے ترتیب دی گئی ہے اور اس کے ۲۴ اراکین ہیں۔

سوسائٹی کی درسگاہ کے متعلق محترم پرویز مرحوم کا، جو اس سوسائٹی کے چیئرمین تھے، منشاء ایک کالج کا قیام

تھا اور اس کی کفالت اور مالی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے ۱۸۴ کنال زمین حکومتِ پنجاب کے گزٹ نوٹیفیکیشن مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۷۳ء کے مطابق ایل. ڈی. اے (L. D. A) سے حاصل کی گئی تھی اور جس کی قیمت حکومت کو ادا کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ۴۷ کنال زمین احباب کو اپر یٹو ہاؤسنگ سوسائٹی نے براہِ راست خریدی تھی۔ گویا کُل زمین ۲۳۱ کنال اس وقت احباب سوسائٹی کے نام موجود ہے۔ بدقسمتی سے اس پراجیکٹ کی تکمیل کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں سامنے آتی رہیں۔ ایک بااثر شخصیت صادق حسین قریشی کو جو پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ اور گورنر رہ چکے ہیں، یہ زمین پسند آگئی اور انہوں نے زمین کے اس ٹکڑے کا بیشتر حصہ جو اب قرآنک ریسرچ سنٹر کے لئے مختص ہے، اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ مقدمات سپریم کورٹ تک پہنچے اور فیصلے فریقِ مخالف کے خلاف قرار پائے جن کے ذریعے قریشی صاحب کو بے دخل کیا گیا۔ لیکن انہی کے ایما پر سابقہ مالکانِ زمین نے مقدمات کا یکے بعد دیگرے سلسلہ شروع کر دیا۔ محترم حبیب الرحمٰن خان، پریذیڈنٹ احباب سوسائٹی کی ان تھک محنت اور تگ و دو سے ہر مقدمے کا عدالتی فیصلہ سوسائٹی کے حق میں ہوتا رہا تا آنکہ گذشتہ سال ساری زمین کا قبضہ سوسائٹی کو پھر سے مل گیا۔ اس کے بعد بھی زمیندار رخنہ اندازیاں کر رہے ہیں لیکن اب انشاء اللہ جلد ہی راستہ مکمل طور پر صاف ہونے کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو توفیق دے کہ اللہ کی راہ پر کئے جانے والے نیک کاموں میں رکاوٹیں نہ بنیں بلکہ ہمارے ممد و معاون بنیں۔

محترم پرویز مرحوم کی ابتدائی تجویز یعنی کالج کے قیام میں دوسری رکاوٹ یہ پیدا ہوئی کہ حکومت نے انگریزی سکولوں کے علاوہ تمام پرائیویٹ تعلیمی ادارے اپنی تحویل میں لے لئے جس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ قرآنک ریسرچ سنٹر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اب ریسرچ سنٹر کے لئے ۶۴ کنال اراضی مختص ہو چکی ہے۔ ہم نے اس کے گرد ایک نامکمل دیوار بھی کھڑی کر دی ہے اور اس رقبہ کی پلاننگ کے لئے ایک کنسلٹینٹ فرم کے ساتھ معاہدہ بھی کر لیا ہے۔ ابتدائی مرحلہ کے کام کے لئے انہیں ۳۰,۰۰۰ روپے فیس بھی ادا کی جا چکی ہے PRE DEVELOPMENT STUDY کی تیاری کے لئے کل فیس دو لاکھ روپے بعد از طویل گفت و شنید طے پائی ہے جس کی دوسری قسط ۲۵,۰۰۰/- روپے، تیسری قسط ۶۰,۰۰۰/- روپے اور چوتھی قسط ۵۵,۰۰۰/- روپے اور آخری قسط ۳۰,۰۰۰/- روپے واجب الادا ہیں۔ فرم نے اس پلاننگ کے کام کو ۲۰ ہفتوں میں مکمل کرنا ہے۔ اس ۶۴ کنال رقبہ میں مندرجہ ذیل شعبے تعمیر کئے جائیں گے:۔

۱۔ قرآنک ریسرچ سنٹر ۲۔ پرائمری سکول
۳۔ ہائر سیکنڈری سکول ۴۔ ڈگری کالج
۵۔ متفرق عمارتیں ۶۔ کھیل کا میدان ۷۔ رہائشی عمارات

چونکہ نامساعد حالات کی وجہ سے ہمارے عزائم کی تکمیل میں ۲۳ سال کا عرصہ بغیر کسی پیش رفت کے گزر چکا ہے اور اس اثنار میں محترم پرویز صاحب بھی وفات پا چکے ہیں، اس لئے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے یہ طے کیا ہے کہ تعلیم کی ابتدار نیچے سے شروع کردی جائے جس میں مروّجہ نصابی تعلیم کے علاوہ اپنے متذکرہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے قرآنِ کریم کی تعلیم بھی شامل ہو اور بچپن ہی سے طالب علموں کا رجحان ہدایتِ قرآنی کی طرف ہو اور وہ بتدریج پختگی اختیار کرتا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی تو کالج کا مرحلہ بتدریج سامنے آئے گا۔ اس وقت تک انشار اللہ ہمیں مزید وسائل اور تجربہ بھی میسّر آجائے گا۔

چنانچہ اسی مقصد کے آغاز کے لئے آج آپ بہن بھائیوں کو ڈان ماڈل سکول DAWN MODEL SCHOOL کے افتتاح میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی عمارت میں جو آپ کے سامنے موجود ہے، ہمیں غالباً دو سال تک سکول جاری رکھنا ہوگا جس کے بعد قرآنک ریسرچ سنٹر کی زمین میں نئی عمارت کی تعمیر کے بعد انشار اللہ سکول کو وہاں منتقل کردیا جائے گا۔

ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کس طریق سے شروع کی جائے گی۔ اس سلسلے میں محترم بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد خاں، رُکن پلاننگ کمیٹی کی طرف سے چند سوالات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سوالات اور ان پر میری تجاویز شائع ہو چکی ہیں۔ اگر آپ حضرات میں سے کوئی صاحب اس معاملہ میں دلچسپی رکھتے ہیں تو وہ ان تجاویز کی کاپی سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی محترم میجر محمد یوسف ڈار صاحب سے حاصل کرسکتے ہیں۔ ہم آپ کی آرار کو خوش آمدید کہیں گے اور ان سے مستفید ہونے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

اخراجات

ظاہر ہے کہ ان عزائم کی تکمیل کے لئے لاتعداد اخراجات کی ضرورت ہے۔ سکول کی موجودہ عمارت جو درحقیقت احباب سوسائٹی کا سائٹ آفس ہے، کو قابلِ استعمال بنانے اور گرد و نواح کی درستگی پر ہم تقریباً ۱،۰۰،۰۰۰ روپے خرچ کرچکے ہیں اور پہلے سال کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ دو لاکھ روپے ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ممبران Q.E.S کی طرف مراسلہ روانہ کرچکے ہیں، جس میں ان سے درخواست کی گئی ہے کہ ہر رکن اپنی گرہ سے یا فراہمیٔ زر کے ذریعے کم از کم مبلغ ۵۰۰/- روپے مہیا کرے۔ (کچھ اراکین کی طرف سے یہ رقم موصول بھی ہو چکی ہے)۔ اس کے علاوہ محترم حبیب الرحمٰن خان صاحب نے بھی اپنے ممبران احباب سوسائٹی سے فراہمیٔ فنڈز کا وعدہ کیا ہے۔

جہاں تک قرآنک ریسرچ سنٹر کی تعمیر کا تعلق ہے اس پر کئی کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ اس سلسلے میں بھی پریذیڈنٹ احباب سوسائٹی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ غیر الاٹ شدہ پلاٹس کی الاٹمنٹ کے بعد ایک معقول رقم

فراہم کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ہمارے اپنے وسائل ناکافی ہوں گے۔ چنانچہ اپنے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ پبلک میں مخیر حضرات سے فنڈز کے حصول کے لئے تگ ودو کریں۔ آپ سب خواتین وحضرات سے میری استدعا ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائیں جب ہم آپس میں مل کر تگ ودو کریں گے تو اللہ کی نصرتیں یقیناً ہمارے شامل حال ہوں گی۔

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ اس تحریک کے اصل علمبردار اراکین بزم ہائے طلوعِ اسلام کے لئے کنونشن کے موقع پر، ان کی رہائش اور اجتماعات کے لئے خاطر خواہ انتظام نہیں ہو پاتا اور کنونشن کا انتظام و انصرام جہاں تک میرا اندازہ ہے ادارہ طلوعِ اسلام پر گراں بار ہوتا ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ آئندہ سالوں میں جب آپ حضرات کنونشن کے موقع پر تشریف لائیں تو قرآنک ریسرچ سنٹر اس پُرسکون اور خوشگوار مقام پر آپ کے لئے دیدہ ودل فرشِ راہ کئے آپ کا منتظر ہو۔

آخر میں اپنے رفقائے کارجن میں بالخصوص محترمہ عارفی سلطانہ ایڈووکیٹ، محترم عمر دراز خان صاحب، میجر محمد یوسف ڈار صاحب، بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد خان صاحب اور شیخ اللہ دتہ صاحب شامل ہیں کا شکر گزار ہوں کہ انہی کے دم قدم سے ہماری جدوجہد جاری ہے۔ دوسری طرف حاجی حبیب الرحمٰن خان صاحب کی جہد مسلسل تحریکِ طلوعِ اسلام کی تاریخ کا ایک الگ اہم باب ہے۔ محترمان عبید الرحمٰن ارائیں، عطاء الرحمٰن ارائیں اور یوسف ضیاء صاحبان جیسے تجربہ کار انجنیئر ہمارے لئے باعثِ تقویت ہیں۔ ٹرسٹ میں محترمہ ڈاکٹر زاہدہ وڑائچ صاحبہ کی خدمات بے مثل ہیں۔ ادارہ طلوعِ اسلام میں محترم لطیف چوہدری صاحب بھی اپنی ڈیوٹی بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔

شکریہ

ڈاکٹر سید عبدالودود

چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

۹ اپریل ۱۹۹۲ء

تحریر: ساجد محمود طالب علم ایم بی اے

"اے ابنِ آدم جاگ ذرا"

سلیم بھائی! سلام و رحمت۔

کیسے ہو؟ ذرا سچ سچ بتانا۔ تمہارا یہ جواب کہ "بس ٹھیک ہی ہوں" مجھے مطمئن نہیں کر سکتا۔ پہلے تو اس فقرے میں ہی "بس" اور "ہی" کے الفاظ کچھ مشکوک سے ہیں۔ دوسرا اتنا عرصہ جانے کہاں غائب رہے۔ نہ کبھی خط لکھا اور نہ فون کیا۔ یاد ہیں نا وہ دن جب بابا جی زندہ ہوا کرتے تھے تو ہر دوسرے دن میرے گھر پر دستک دے رہے ہوتے تھے۔ کبھی ہاتھ میں مفہوم القرآن پکڑا ہے اور کبھی وہ خطوط جو بابا جی نے تمہیں لکھے تھے کبھی تصوف کی حقیقت اور کبھی اسبابِ زوالِ امت۔ یاد ہے تجھے گھنٹوں بیٹھ کر ہم بابا جیؒ کی باتوں پر غور کیا کرتے تھے۔ بابا جی تو میں بس روانی میں ہی کہہ گیا ورنہ ہم تو قرآن پر ہی غور کیا کرتے تھے۔ بابا جی تو ساری زندگی کہتے ہی رہے جو قرآن میں ہے۔ کتنا فخر کیا کرتے تھے تم فکرِ قرآنی سے وابستہ ہونے کا۔ ہاں بھئی میں کب انکار کر رہا ہوں مجھے بھی فخر تھا اور اب بھی ہے۔ بس روٹھ گئے تاکہ تمہارے بارے میں لفظ "ہے" کیوں نہیں استعمال کیا۔ مگر کیا کروں اتنے عرصے سے غائب ہو۔ "حسنِ ظن" بھی نہیں رہا۔ اگر زیادہ گراں گزرے تو معاف کر دو۔ اب ہاتھ جوڑنے سے تو رہا سامنے تو تم ہو نہیں۔ مگر پھر بھی کہوں گا ضرور ذرا دل کو ٹٹولو تو سہی تمہارے لئے لفظ "تھا" موزوں ہے یا "ہے"۔

یاد ہے تمہیں وہ دن جب پہلی دفعہ تم ہمارے گھر آئے تھے بابا جی کے خطوط کے ساتھ۔ ہاں بھئی اس دن میں بھی بہت خوش تھا کیونکہ اس دن ہمارا رزلٹ آیا تھا اور میں نے ایف ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کر لی تھی۔ ان دنوں تم مجھ سے دو کلاس آگے تھے مگر ہماری دوستی مثالی تھی۔ ہاں تو اس دن تم آتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے تھے اور مجھے کامیابی پر مبارک باد دی تھی۔ پھر میری والدہ کو بھی بڑے ادب سے سلام کرنے کے بعد مبارک باد دی تھی۔ تمہارے ہاتھوں میں ایک سبز رنگ کا پیکٹ تھا جو تم نے مجھے پکڑا دیا تھا۔ یاد ہے میں نے حیرانی سے پوچھا تھا "یہ

کیا ہے"۔ تم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا تھا "خود ہی دیکھ لو۔ تمہارے لئے تحفہ ہے اس کامیابی پر"۔ میں نے جلدی جلدی پیکٹ کھولا تو اس میں تین کتابیں تھیں "سلیم کے نام خطوط' حصہ اوّل' حصہ دوم' حصہ سوم"۔ کتابیں دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا کیونکہ مطالعہ کا تو مجھے جنون رہا ہے مگر جونہی میری نظر مصنف پر پڑی تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور وہ کتابیں میرے ہاتھوں سے نیچے گر گئیں۔ تم نے وہ کتابیں جلدی جلدی اٹھائیں اور شکایتی انداز میں دیکھنے لگے تھے۔ میں نے پرویز صاحب کا نام محلّے کے مولوی خیر دین سے سُنا ہوا تھا (وہ مسٹر پرویز کہہ کر پکارتے تھے)۔ کوئی جمعہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ پرویز صاحب کو مہذّب الفاظ میں "شرعی گالیاں" نہ دیتے ہوں۔ منکرِ حدیث' منکرِ رسالت' گستاخِ رسول' ذلیل' گمراہ تو اکثر کہا کرتے تھے۔ منبر پر کھڑے ہو کر مولوی خیر دین کہا کرتے تھے' دیکھو پرویز کہتا ہے میں قرآن کا طالب علم ہوں۔ اس طالب علم نے سنّت رسولؐ (داڑھی) بھی نہیں رکھی۔ میں سوچا کرتا تھا' بھلا پرویز کیسا مسلمان ہے جس نے دو ہاتھ داڑھی بھی نہیں رکھی جیسے داڑھی ہی اسلام ہو۔

مختصراً پھر تم تحفہ (کتابیں) دینے کا اصرار کر رہے تھے اور میں مسلسل انکار۔ اتنے میں میری والدہ چائے اور کچھ بسکٹ لے آئیں اور تم نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ تم نے چائے کو تحفے کی قبولیت کے ساتھ مشروط کر دیا تھا (کتنے ضدی تھے بلکہ کہنا چاہیئے دُھن کے پکے تھے)۔ جب والدہ کو ہمارے اس "شاخسانے" کا علم ہوا تو وہ بھی کہنے لگیں' ساجد بیٹا لے لو کتنی چاہت سے تمہارے لئے کتابیں لایا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا۔ پرویزؒ صاحب کو وہ جانتی نہ تھیں۔ صرف "پکّی روٹی" ہی انہوں نے پڑھی ہوئی تھی۔ پھر وہ ہوا جو شاید نہ ہوتا تو میں آج تمہیں خط نہ لکھ رہا ہوتا۔ اتنے میں محلّے کی مسجد میں مولوی صاحب تقریر کرنے لگے۔ ان کی تان یہاں پر آ کر ٹوٹتی تھی' ہم خدا سے نہیں ڈرتے' ہمارے دلوں سے خدا کا ڈر نکل گیا ہے' جو خدا سے ڈرتے ہیں وہی جنّت میں جائیں گے۔ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ مسلمان ہی نہیں۔ پاس ہی میرا چھوٹا بھائی خرم کھڑا تھا جو میز پر بسکٹ اور چائے دیکھ کر آ گیا تھا۔ حیرانی سے کہنے لگا "اللہ میاں کوئی جن ہیں' ان کے ہاتھ کتنے ہیں' ان کے دانت کتنے بڑے ہیں' کیا وہ بہت خوفناک ہیں"۔ یاد ہے نا امّی نے چھ سالہ خرم سے کہا تھا "نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ اللہ میاں تو بہت خوبصورت ہیں' جو اللہ میاں کا حکم نہیں مانتے ان کو وہ سزا دیتے ہیں اس لئے ان سے ڈرنا چاہیئے"۔

مجھے یاد ہے تم نے پھر میری والدہ سے کہا تھا "اللہ میاں اپنا حکم نہ ماننے پر سزا کیوں دیتے ہیں۔ پھر تو اللہ میاں بھی گاؤں کے چوہدری دین محمد کی طرح ہو گئے تاکہ رُعب داب سے حکم منوایا جائے تاکہ چودھراہٹ قائم رہے"۔ پھر والدہ نے تمہیں پیار سے سمجھایا تھا "بیٹا اللہ کے بارے میں ایسے نہیں کہا کرتے"۔

مجھے یاد ہے پھر تم نہایت متانت سے کہنے لگے "خالہ جان' یہ میں نہیں آپ کہہ رہی ہیں۔ اپنے فقروں کا

ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھیں۔ اللہ میاں ان چیزوں سے بہت بلند ہیں۔ اللہ سے ڈرنے کا مطلب ہے اللہ کے قوانین کے نتائج سے ڈرنا' اور اللہ کے قوانین سے مراد وہ قوانین ہیں جو اس کی کتاب قرآن مجید میں ہیں۔ انسان عبارت ہے جسم اور ذات سے۔ جسم کی نشوونما ہوتی ہے طبیعی قوانین کے مطابق' جیسے ہوا، پانی، غذا اور ذات کی نشوونما ہوتی ہے ان مستقل اقدار کو اپنانے سے جو ضابطۂ خداوندی میں موجود ہیں جیسے عدل کرنا' دوسروں کی نشوونما کے لئے وقت اور دولت دینا' سچ بولنا' ایسا انتظام کرنا جس میں کوئی کسی کو حقیر نہ سمجھے' ایسا نظام قائم کرنا جس میں حاکمیت صرف خدا کی ہو۔ تسخیرِ کائنات کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے مستقل اقدار کے مطابق استعمال کرنا۔ چونکہ انسان عبارت ہے جسم اور ذات سے۔ جسم طبیعی قوانین کے مطابق مرجاتا ہے اور انسانی ذات زندہ رہتی ہے اور زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ جن انسانوں کی ذات نشوونما یافتہ ہوگی وہ ہی ارتقائی منازل طے کر سکیں گے اور جنت میں جائیں گے۔ اللہ سے ڈرنے کا مطلب ہے جس طرح تم آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہو کہ ہاتھ جل جائے گا، گہرے پانی میں ڈوبنے سے ڈرتے ہو' اس طرح ایسے تمام کاموں سے ڈرو جس سے تمہاری ذات کی نشوونما رک جائے۔

اہم سوال یہ ہے کہ اللہ میاں نے جو انسانی ذات کے لئے قوانین بنائے ہیں وہ کیوں بنائے ہیں؟ صرف اس لئے کہ جو نہ مانے یا جس کی ذات غیر نشوونما یافتہ رہ جائے اس کو جہنم میں پھینک کر انسانوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھے۔ خالہ جی' قطعاً ایسا نہیں' اللہ تعالیٰ نے انسانی ذات کے لئے جو قوانین بنائے ہیں ان کے اپنانے سے انسانوں کا باہمی ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفادات کی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی تمام الجھنیں اور پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ جب انسانوں میں مفادات کی جنگ ختم ہو جاتی ہے تو پھر انسانوں کے لئے موقع ہوتا ہے کہ اللہ نے ان کو جو امکانی صلاحیتیں دی ہیں ان کی نشوونما کر سکیں۔ اس طرح یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے اور انسان ثابت کرتا ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ جدید ارتقائی منازل طے کر سکے۔"

یاد ہے ناسلیم' تم ہمیں آدھا گھنٹہ فطرت' جبلت' ایمان اور انسانی ذات پر لیکچر دیتے رہے اور تمہارا لیکچر سنتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نہ کوئی جن ہے اور نہ چوہدری دین محمد۔ پھر جب میں نے تمہیں کچھ باتیں دہرانے کے لئے کہا تو تم نے بابا جیؒ کے خطوط مجھے پکڑاتے ہوئے کہا تھا ان میں سب کچھ لکھا ہے آرام سے پڑھ لینا۔ پھر میں نے کانپتے ہاتھوں وہ کتابیں تمہارے ہاتھ سے لیں۔ کتنے خوش ہوئے تھے تم۔ پھر چائے پینے کے بعد تم چلے گئے تھے۔ میری والدہ بھی تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔

چند دن تک تو میں نے کتابوں کو ہاتھ ہی نہ لگایا۔ پھر ہمت کر کے سلیم کے نام پہلی جلد پڑھنا شروع کی۔ پھر کیا تھا پڑھتا ہی گیا۔ پہلی جلد' دوسری جلد' تیسری جلد۔ تیسرے ہی دن تم ہمارے گھر آئے تو میں تینوں جلدیں

پڑھ چکا تھا۔ پھر تم نے اور میں نے بہت سے دوستوں کو باباجی کے خطوط تحفے میں دیئے تھے۔ سبھی دوست میرے جیسا ہی ردِ عمل ظاہر کرتے تھے مگر ہم ان کو قائل کر لیا کرتے تھے۔ اصل میں تو باباجی ہی قائل کرتے تھے۔ ہم تو صرف ان کی کہی ہوئی باتیں بتایا کرتے تھے۔ یاد ہے اس سال ہم نے مری کی سیر کا پروگرام بھی منسوخ کر دیا تھا اور ان پیسوں سے باباجیؒ کی کتابوں کی لائبریری بنائی تھی۔ جو بھی ملتا اسے لائبریری کی ممبرشپ کی دعوت دیا کرتے تھے۔ پھر ہماری دیکھا دیکھی آصف اور بشارت نے بھی اپنے محلے میں لائبریری بنالی۔

یاد ہے ہم ہر روز دو گھروں میں باباجیؒ کی درسِ قرآن کی آڈیو کیسٹیں دیا کرتے تھے اس التجا کے ساتھ کہ سننے کے بعد ہمیں کل واپس کر دیجئے گا۔ باباجیؒ کا درسِ قرآن سن کر کتنے لوگ فکرِ قرآنی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مولوی خیر دین صاحب بھی ہماری دعوت سے متاثر ہو گئے تھے نا۔ یاد ہے نا تمہیں، میں سگریٹ پیا کرتا تھا اور تم پان کھایا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے یہ عادتیں چھوڑ دیں اور ان پیسوں سے مفہوم القرآن خرید کر مفت تقسیم کیا کرتے تھے۔

میری جان سلیم، میں تو آج بھی ویسا ہی کر رہا ہوں اور بھی بہت کچھ۔ اب بتاؤ تم کیا کر رہے ہو؟ باباجیؒ کے خطوط یاد ہیں کہ نہیں؟ باباجیؒ نے لکھے تجھے تھے مگر جو بھی پڑھتا ہے ایسے سمجھتا ہے جیسے اسے لکھے گئے ہوں۔ جواب دو گے نا! خدا تمہیں سلامت رکھے۔

والسلام

تمہارا دوست

ساجد محمود

قانونِ خداوندی کی میزان جان و مال سے جدّوجہد کرنے والوں

کے مدارج

سہل انگاروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے

آصف جلیل
(سعودی عرب)

پہلا قدم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی نعمت عطا کی جو اسے دوسری مخلوق سے متمیز کرتی ہے۔ انسان کے علاوہ شاید ہی ایسی کوئی مخلوق ہو جو غور و فکر سے کام لینے کی اہلیت رکھتی ہو۔ لیکن کیا فرق رہ جاتا ہے فہم و ادراک سے عاری اس مخلوق میں اور اس انسان میں جو عقل رکھتے ہوئے بھی غور و فکر سے کام نہ لے؟ قرآن نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۹ میں اس فرق کو بڑے ہی بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور بہت سے جن و انس اس بنا پر جہنم رسید ہو جائیں گے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی اسے استعمال میں نہیں لاتے اور اپنی آنکھوں سے بغور نہیں دیکھتے اور کان رکھتے ہیں لیکن ان سے صحیح طور پر سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔ یہی لوگ (اپنے انجام سے) غافل ہیں۔

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ (۶۷/۱۰)

اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے تو آج جہنمیوں کے ساتھ کیوں ہوتے۔

رسول اللہ نے جب اسلام کی دعوت دی تو یہی کہا کہ خوب غور کرو "ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا"۔ اس کے بعد

جو دین میں پیش کرتا ہوں اسے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرو۔

ہماری پوزیشن قدرے مختلف ہے کیونکہ ہم لوگ سب کے سب نہیں تو اکثر پیدائشی مسلمان ہیں اور اسی فرقے سے متعلق ہیں جس کے ساتھ ہمارے باپ دادا وابستہ تھے۔ اسلام بحیثیت دین کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سوچنا ہم نے اپنے اوپر صدیوں سے حرام قرار دے رکھا ہے اور اب تو شاید ہمارے ذہن کے دریچے اس قدر زنگ آلود ہو چکے ہیں کہ ان کا کھلنا محال نظر آتا ہے۔ مولوی صاحبان کا پیدا کردہ یہ خوف کہ دین کے معاملے میں جس کسی نے عقل سے کام لیا وہ گمراہ ہو جائے گا، اس شدت سے طاری ہے کہ کسی نئی فکر کا تصور ہی ہم پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔

ان حالات میں قرآنی فکر کو آگے بڑھانے والوں کا فرض ہے کہ وہ دلوں پر لگے ہوئے یہ قفل توڑیں اور غور و فکر کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ ان کی ان کوششوں سے جس کسی انسان نے بھی سوچنا شروع کر دیا، سمجھ لیں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیش کردہ اسلام کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا ہے اور پہلا قدم ہی تو ہے جس کا اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔

صرف علم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تنہا علم کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے نہ ہی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے

صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں اس قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ کا ہونا بھی از بس ضروری ہے

علی محمد چدھڑ

ایک خط۔ ایک سوال

محترم ایڈیٹر صاحب ماہنامہ طلوعِ اسلام۔

السلام علیکم، حکیم محمود صاحب جمعیت اہلحدیث گوجرانوالہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اپنے باپ مولانا محمد اسماعیل مرحوم کی نسبت سے جماعت میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ حکیم حاذق ہیں اور گولڈ میڈل کا اعزاز رکھتے ہیں۔ مرکزی دفتر اہل حدیث کے ناظم بھی ہیں اور بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی جو تحریک چلی تھی، اس کی قیادت بھی کر چکے ہیں۔ ۱۴۔ مارچ ۱۹۹۲ء کو میں نے ایک خط بذریعہ رجسٹری انہیں ارسال کیا تھا۔ جس کی نقل ادارہ کی اطلاع کے لئے اس گذارش کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ ابھی تک ان کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

خیر اندیش
علی محمد چدھڑ

خط بنام حکیم محمود صاحب، جمعیت اہل حدیث، گوجرانوالہ

السلام علیکم _____ مکرمی حکیم صاحب

میں ایک طالب علم ہوں یعنی دینِ اسلام کے متعلق کچھ سیکھنے اور جاننے کا متمنی اور آپ ہیں ماشاء اللہ ایک علمی اور دینی گھرانے کے چشم و چراغ۔ اپنی خطابت سے عام مسلمانوں کو مستفید کرنے کے لئے جمعہ کی نماز آپ عموماً ماڈل ٹاؤن کی مسجد مکرم میں ادا کرتے ہیں۔ مورخہ ۲۷/۳/۹۲ کو آپ نے دوسری باتوں کے علاوہ فرقہ بندی کو بھی موضوعِ سخن بنایا۔ آپ نے قرآنِ کریم کا یہ فرمان سنایا کہ ارشادِ ربانی تعالیٰ ہے کہ

"جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقوں میں بٹ گئے تو (اے نبیؐ) تیرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔" (۶/۱۶۰)۔

بات اتنی صاف اور مدلل ہے کہ قرآن کے اس حوالے کے بعد فرقہ پرستوں کا تعلق رسولِ پاکؐ سے یقینی طور پر منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۷ اور نمبر ۱۰۸ کا ذکر کیا جس میں مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے "مسجدِ ضرار" کا بیان ہے اور حضورؐ کو وہاں جانے سے منع کیا گیا ہے تاکہ مسلمان ایک رہیں اور ان میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ ہوجائے۔ مورخہ ۳/۴/۹۲ کو بھی آپ نے خطبہ کے آخر میں یہی موضوع اختیار کیا کہ ہمیں وہابی، بریلوی یا دیوبندی کے بجائے اہلِ سنّت یا اہلِ حدیث کہلوانا چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ سازی کو قرآنِ کریم نے کفر اور شرک قرار دیا ہے۔ لیکن مجھے جس بات نے آپ کو تحریر کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہوکر فرقہ بندی کے خلاف قرآن سے حوالے دے رہے ہیں اور دوسری طرف بذاتِ خود مسلمانوں کے ایک فرقہ کے فعال رکن بلکہ لیڈر ہیں اور وقتاً فوقتاً دین کے اسی پلیٹ فارم سے اپنے فرقہ کے مسلک کی تبلیغ بھی کرتے رہتے ہیں اور مخصوص طور پر چندہ کی اپیلیں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ آپ سوچیئے کہ جواز دے قرآن فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہو، وہ خود ایک خاص فرقہ کو کیسے فروغ دے سکتا ہے۔ اور پھر آپ کہتے ہیں کہ اپنے مسلک کو کسی جگہ یا آدمی سے منسوب نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اہلِ سنّت یا اہلِ حدیث کہلواؤ۔ اگر یہ دونوں نام آپ کے خیال کے مطابق متبرک ہیں تو پھر اہلِ قرآن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ آج ہم اپنے آپ کو بڑے فخر کے ساتھ اہلِ حدیث یا اہلِ سنّت کہلوانا پسند کرتے ہیں حالانکہ قرآن کی سورہ الحج کی آیت نمبر ۷۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

"تمہاری جماعت کا نام مسلم بھی کوئی نیا نام نہیں، خدا نے اس قسم کی جماعتوں کا نام پہلے بھی مسلم ہی رکھا تھا اور اب اس قرآن میں بھی یہی نام تجویز کیا گیا ہے"۔

میرے محترم حکیم صاحب!

فرقہ بندی کے متعلق اپنے خطبہ میں آپ کبھی کبھی سورۂ الروم کی آیت نمبر ۳۲ کا حوالہ بھی دیا کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ "لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہوکر بیٹھ جاتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہماری فخر کا پورا ایکس رے کردیا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی فرحون کے گروہ میں ہی سمجھتا ہے اور دوسروں کو گمراہ اور مشرک قرار دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حمام میں ہم سب ننگے ہیں اور کوئی بھی کسی کو الزام نہیں دے سکتا۔ جہاں تک مسجدِ ضرار کا تعلق ہے اس میں یہ عیب نہیں تھا کہ اس میں پڑھی جانے والی نماز دوسرے مسلمانوں سے مختلف تھی اور نہ ہی اس کے پڑھنے کا طریقہ کوئی دوسرا تھا۔ مقلد اور غیر مقلد

کا سوال بھی ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔ تو پھر کیا تھا جس کے لئے پیغمبرِ خدا کو اس مسجد میں قدم رکھنے کی ممانعت آگئی۔ دراصل اس مسجد کے معماروں کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک علیحدہ مسجد تعمیر کر کے مؤمنین کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہماری یہ حالت ہے کہ نمازیں مختلف، پڑھنے کے طریقے الگ اور ان کے اوقات بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مساجد الگ ہیں اور ہر فرقہ دھڑا دھڑ مسجدیں بنا رہا ہے۔ پھر بھی ہم اپنی مساجد کو مسجدِ ضرار سے مماثلت دینے کے لئے تیار نہیں۔ آخر یہ کون فیصلہ کرے گا کہ فلاں مسجد، مسجد ضرار ہے اور فلاں مسجد کو مسجدِ قبا کے مراتب حاصل ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ فیصلہ کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں جب کہ ہماری ہر مسجد اپنے فرقہ سے پہچانی جاتی ہے اور قرآن و حدیث کی رو سے فرقہ بندی کفر و شرک ہے اور ناقابلِ معافی جرم۔ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ ہم سب اس گھناؤنے جرم کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں۔ فرقہ بندی سے تائب ہو کر ہمیں تو خدا کے خوف سے لرز اٹھنا چاہیئے تھا لیکن مذہب کی گرفت اور ذاتی مصلحتوں سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں۔ چنانچہ 'جنگ فورم' کے ریکارڈ کے مطابق تمام مذہبی علماء جن میں اہلِ حدیث کے راہ نما بھی شامل تھے، فرقہ بندی کے ناقابلِ معافی جرم کا حل یہ نکالا کہ فرقوں کا نام بدل کر مکاتبِ فکر رکھ دیا، اور یوں ان کی سربراہی بھی قائم رہی اور وہ بزعمِ خویش مکافاتِ عمل کی گرفت سے بھی بچ گئے۔ گویا رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر انہوں نے نہ صرف اپنی قیادت محفوظ کر لی بلکہ نام کی اس تبدیلی سے عوام کو بھی مطمئن کر دیا۔ قرآن شریف اسی لئے ان مذہبی پیشواؤں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ یہی ہیں وہ مذہبی لیڈر جن کے متعلق عوام خدا سے عرض کریں گے کہ

"اے پروردگار ہمارے! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور اکابر کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے گمراہ کر دیا۔" (سورۂ احزاب آیت ۶۷)

اور یہی ہیں وہ مذہبی پیشوا جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

"قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا۔" (سورۂ نحل آیت ۲۵)

خدا نے فرقہ بندی کہا (فَرَّقُوْا) انہوں نے اس کا نام مکاتبِ فکر رکھ لیا۔ الفاظ کی تبدیلی ہی تو ہے جس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ

"کچھ نام ہیں جو پہلے تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے (اور اب تم رکھ رہے ہو)۔"
(سورۂ یوسف آیت ۴۰)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ محض فکری اختلافات ہیں تو قرآن کریم نے جس چیز کو تَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (سورۂ توبہ ۱۰۷) اور فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ (سورۂ روم آیت ۳۲) سے تعبیر کیا ہے وہ کیا ہے۔ اس کی کوئی مثال سامنے

آنی چاہیئے۔ تاکہ مکتبِ فکر اور فرقہ بندی کا فرق سامنے آسکے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"بنی اسرائیل کی قوم بہتر (۷۲) فرقوں میں منقسم ہوگئی تھی میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں منقسم ہوگی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔"

اس حدیث کو تمام فرقے صحیح تسلیم کرتے ہیں اور اپنے فرقہ کو جنتی (اور دوسرے کو دوزخی) ثابت کرنے کے لئے بطور سند پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے موجودہ فرقے مکاتبِ فکر ہیں، تو وہ تہتر فرقے کون سے ہیں اور اگر فرقہ کوئی بھی نہیں تو پھر حضورؐ کے اس ارشاد کے متعلق کیا کہا جائے گا۔

قابلِ صد احترام حکم صاحب!

آپ کا شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ علمائے دین میں ہوتا ہے اور میں آپ کی اقتدار میں نمازِ جمعہ ادا کرنے والا ایک گنہگار اور کم علم انسان ہوں۔ اگر میں آپ کو کوئی ملاں مودی خیال کرتا تو یہ چند سطور کبھی تحریر نہ کرتا۔ میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے آپ کو تحریر کر دیا ہے۔ یہ میرے دل کی خلش ہے اور جس طریقے سے دین کی ان اُلجھنوں کو میں نے محسوس کیا ہے۔ وہ میرے دیگر بہت سے مسلمان بھائیوں کے دل کی آواز بھی ہو سکتی ہے۔ توقع ہے کہ آپ اپنی ذاتی فراخدلی کے مطابق تحریری طور پر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

والسلام

علی محمد چدھڑ

استحکامِ ذات

کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی اور عالمگیر ربوبیت کا انتظام کرے۔

ملک حنیف وجدانی

"قرآن خوانی یا قرآن فہمی"

عنوان بالا سے جناب علی محمد چدھڑ صاحب کا مضمون مئی ۱۹۹۲ء کے طلوعِ اسلام میں پڑھا۔ میں اس بارے میں چند مزید توضیحات پیش کرتا ہوں۔

۱۔ کسی مرحوم کے لئے قرآن خوانی کا سب سے بڑا ثواب جو عام اجتماعات میں سامنے آیا وہ مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کے چہلم پر ہوا۔ ۲۳ ستمبر ۸۸ء "دعا پر آرمی ہاؤس سے اعلان کیا گیا کہ ۶۰ ہزار ختم قرآن پاک جمع ہوتے ہیں۔ ان میں قیدیوں کے ۶۰۳۶ ختم قرآن پاک شامل ہیں"۔

(جنگ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۸ء)

قرآن خوانی کا ثواب اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ کسی بھی بڑے آدمی کے چہلم یا برسی پر حافظ حضرات ساری رات لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت جاری رکھتے ہیں۔ اکثر ایک رات میں ایک قرآن پاک ختم کر لیا جاتا ہے۔ حافظ حضرات اس کا کیا معاوضہ لیتے ہیں، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اگر یہ دعائیں اور بخشش کے اعمال افراد کے لئے ہیں، تو کیا کوئی مُردہ قوم، مُردہ اُمت یا مُردہ ملت بھی اس سے کچھ حصہ پا سکتی ہے یا نہیں۔ آج اُمتِ مسلمہ زندہ نہیں۔ آج ملتِ اسلامیہ مُردہ ہو چکی ہے۔ فرقوں اور وطنی حد بندیوں نے اس کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ میں ان حافظ حضرات سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اس معاملے میں بھی ثواب پہنچانے کا کوئی عمل کارگر ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو آپ کیوں نہیں کرتے؟

ظاہر ہے کہ اُمتِ مرحومہ کو یوں قرآن خوانی کے ایصالِ ثواب سے زندہ نہیں کیا جا سکتا، تو اس کو زندہ کرنے کا کیا طریقہ ہو گا۔ وہ کہاں سے مل سکے گا؟

۲۔ میں ایصالِ ثواب کے ان تمام پروگراموں کے برعکس اس بات کو اہمیت دوں گا کہ اس ملتِ مرحومہ کو زندہ کرنے کے لئے ختم قرآن شریف کا کوئی بندوبست کیا جائے جو قرآن فہمی سے ہو۔

آیئے علامہ حضرات! مفسر حضرات! حافظ حضرات! ایک پروگرام بنایئے، شاہ فیصل مسجد اسلام آباد یا بادشاہی مسجد لاہور میں جمع ہو کر قرآن فہمی کا ختم قرآن شریف مکمل کیا جائے۔ چاہے اس کے لئے ہفتہ مہینہ لگ جائے لیکن قرآن فہمی کا یہ ختم شریف مکمل ہونا چاہیئے۔ آیئے اس ملتِ اسلامیہ کی بھوک کا کوئی حل تلاش کریں۔ عصرِ حاضر کے مشہور مفکر جارج برناڈ شاہ نے کہا تھا:

"انسان کی ہر بیماری کی ابتداء اس کے پیٹ سے ہوتی ہے۔ بعینہٖ معاشروں، ملکوں اور قوموں کی بیماریوں کا آغاز بھی ان کی بھوک سے ہوتا ہے۔"

(بحوالہ) احمد ندیم قاسمی روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ء

۳۔ آیئے قرآن فہمی کے لئے ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت پر غور و فکر کریں، پیٹ کی بھوک ختم کرنے کا کوئی حل دریافت کریں تاکہ مسلمان ممالک اس لعنت سے تو چھوٹ جائیں۔ اس کے علاوہ غور و فکر سے ثابت کریں کہ

۱۔ قرآن کے ساتھ قوتِ نافذہ کو کیسے شامل کیا جائے۔

۲۔ انسان کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔

۳۔ سود کے برعکس اسلام کا متبادل معاشی نظام کیا ہے۔

۴۔ سیاسی پارٹیوں کی نفرت انگیزی سے بچنے کے لئے کون سا مشاورتی نظام اختیار کیا جائے۔

۵۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس فرض کے حصول کا طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے۔

۶۔ تسخیرِ ارض و سماء میں ہم اہلِ مغرب سے پیچھے رہ گئے ہیں اور بقول اقبالؒ ؎

علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں۔

ہم ان علوم کو کس طرح قرآنی جذبے سے حاصل کرنے والے بن سکتے ہیں۔

۷۔ قرآن انفاقِ رزق و مال پر زور دیتا ہے۔ جمع کرنے کے خلاف ہے، تو سرمایہ داری کا انجام کیا ہوگا۔

۸۔ "الارض للہ" کے قرآنی الفاظ ثواب کے لئے ہیں یا اس فلسفہ کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ یوں جاگیرداری کا انجام کیا ہوگا۔

اگر ہم نے قرآن فہمی کا ایک ایسا ختم شریف مکمل کر لیا، تو گویا بلاغ القرآن کا فریضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اگر کسی پر عذابِ خداوندی آئے گا تو آپ یقیناً بری الذمہ ہوں گے۔

حقائق و عبر

۱۔ اب تُو ہی بتا..........

۱۲؍مارچ ۱۹۹۱ء ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے جناب مفتی نعیمی صاحب نے مندرجہ ذیل حدیث، بیان فرمائی۔

"کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی شخص کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھے تو اسے قتل کر سکتا ہے۔" عدالتی فیصلے کی ضرورت نہیں۔　　(روزنامہ پاکستان ۱۳؍مارچ ۱۹۹۱ء)

مندرجہ بالا بیان کے حوالہ سے ہفت روزہ تنظیم اہلِ حدیث اپنی ۱۵؍مئی ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے کہ "اس مضمون کی کوئی حدیث ہے ہی نہیں۔" اور یہ کہ "یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے۔"

۲۔ رُشدی کون؟

"گوالا کالونی رکھ چندار کی جامع مسجد میں مؤرخہ ۲۵؍مارچ بمطابق ۲۰ رمضان المبارک بروز اتوار بوقت نمازِ عصر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ایک مولوی حافظ ابراہیم نے تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

۱۔ اے اللہ والو، اللہ کا ذکر کیا کرو، اللہ کا ذکر کیا کرو۔

"یہ ذکر یہ ہے لا الٰہ الا اللہ، یہ ذکر تم ..امرتبہ، ...امرتبہ، .....امرتبہ کرو تو آپ کو ثواب ہوگا لیکن اگر کسی نے ایک مرتبہ بھی محمدؐ رسول اللہ پڑھ لیا تو بلاشبہ اس نے شرک کیا۔"

"اس کی دیسی مثال میں اس طرح دیتا ہوں کہ اگر دودھ کا ایک کین (برتن) بھرا ہو تو اس میں خود اپنے ہاتھ سے پیشاب کا ایک قطرہ ڈال دو تو سارا دودھ ضائع ہو جاتا ہے۔ اور دودھ حرام ہو گیا۔ جس طرح پیشاب کے ایک قطرے سے دودھ ضائع ہو گیا بعین اسی

طرح ایک مرتبہ محمدؐ رسول اللہ کہنے سے سارے ذکر ضائع ہو گئے اور ثواب کی بجائے الٹا عذاب ہوگا۔" (ماہنامہ سبیلِ ہدایت، بابت مئی ۱۹۹۲ء صـ۳)

۳۔ لوگ کہتے ہیں۔

"قائدِ اعظم" کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے مدیر "محقق" لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب خان صاحب، جون کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

"ایک زمانہ تھا جب پڑھے لکھے لوگوں کو مولوی کہتے تھے جیسے بنگال کے وزیرِ اعظم کو مولوی فضل الحق اور بابائے اُردو کو مولوی عبدالحق۔ پھر لفظ مولوی ناپسندیدہ ہو گیا اور کچھ لوگ بالخصوص مسجدوں کے مولوی مولانا بن گئے۔ سیاسی لیڈر بھی مولانا کہلانے لگے مثلاً مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی خان۔ اس ماحول میں انگریزی طرز کے ایک شخص محمد علی جناح سیاست میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں مولانا نہیں ہوں۔ مجھے سیدھے طور پر مسٹر جناح کہو۔

پھر یہ ہوا کہ ۱۹۳۰ء میں ایک شخص عنایت اللہ خان جو ریاضی، سائنس، انگریزی اور عربی فارسی پڑھے ہوئے تھے اور اسلام پر اپنی کتاب تذکرۂ عربی اور اُردو میں لکھ کر شہرت پا چکے تھے، سامنے آئے۔ انہوں نے عسکری تنظیم کی بنیاد رکھی، اپنے نام کے ساتھ علامہ لکھا اور چونکہ عربی میں فوجی کمانڈر کو قائد کہتے ہیں اس لئے قائدِ تحریک کہلانا شروع کیا۔۔۔۔۔۔ یوں لفظِ علامہ اور قائد پہلی دفعہ استعمال ہوئے۔ پھر جب محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے صدر کے طور پر پاکستان کے لئے کام شروع کیا تو کسی نے انہیں قائدِ اعظم کہا۔ یعنی لیڈر تو بہت ہیں مگر سب لیڈروں کا لیڈر یہ شخص ہے۔ اس لفظ کو شہرت غلام احمد پرویز نے دی۔

۴۔ بر سبیلِ تذکرہ

۱۔ پنجاب اسمبلی کے ۲۴۸ ارکان میں سے ۱۷۱ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ۴۵ ایف اے، ۴۲ میٹرک، ۱۸ مڈل اور ۳۰ ان پڑھ ہیں۔ ان میں ۲۰ وزیر، ۱۱ مشیر، ۲۱ پارلیمانی سیکرٹری، ۲۲ چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی اور ایک قائد حزبِ اختلاف ہے۔ ممبران کی تنخواہوں اور سفر خرچ پر سال میں چھ کروڑ باون لاکھ تیس ہزار روپے خرچ آتے ہیں۔ عمارت

کی دیکھ بھال، سٹاف کی تنخواہیں اور وزیر اعلیٰ، سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے اخراجات ان کے علاوہ ہیں۔ ایک سال میں اسمبلی نے ۱۷ دن کام کیا اور ۱۳ بل پاس کئے۔ (روزنامہ جنگ یکم مئی ۱۹۹۲ء)

۲۔ عوام کے خادموں کی سرکاری رہائش گاہیں، صرف رقبے کے اعتبار سے!

شہر	کمشنر (کنال)	ڈپٹی کمشنر (کنال)	ڈی آئی جی پولیس (کنال)	ایس پی (کنال)	سیشن جج (کنال)
فیصل آباد	۷۰	۷۴	۸۸	-	-
ملتان	۶۰	۴۸	-	-	-
سرگودھا	۱۰۴	۵۴	۴۳	۴۲	۳۴
راولپنڈی	۴۰	۴۱	۲۱	-	-
ڈیرہ غازی خان	۸۷	۵۵	۳۸	۲۳	۵۵
ساہیوال	-	۶۴	-	۱۰۰	-
میانوالی	-	۹۶	-	۷۵	۷۰

تحقیق: ارشاد احمد حقانی ۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ، ۱۵ جون ۱۹۹۲ء)

۵۔ ایک گناہ اور سہی

روزنامہ جنگ بابت ۲۳ جون کی ایک خبر کے مطابق "مولانا سمیع الحق کی اطلاع غلط نکلی"۔ دوستم نے ریڈیو پر خطاب کیا۔ پوری خبر یوں ہے:

"کابل (اپ پ) جنرل عبدالرشید دوستم نے پیر کو ریڈیو پر خطاب کیا تاکہ ان خبروں کی ذاتی طور پر تردید کر سکیں کہ وہ طیارہ کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ مولانا سمیع الحق کے حوالے سے خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک طیارہ جو ازبک ملیشیا کے سربراہ جنرل دوستم کے علاوہ صدر ببرک کارمل کو لے کر مزار شریف سے کابل جا رہا تھا راستے میں گر کر تباہ ہو گیا۔ میں زندہ ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو آئیں اور مجھے دیکھیں۔"

طلوعِ اسلام: ایسی ہی بے پر کی جناب سمیع الحق، علامہ غلام احمد پرویزؒ کے خلاف بھی اڑا چکے ہیں جسے وہ آج تک ثابت نہیں کر پائے۔ (طلوعِ اسلام فروری ۱۹۸۸ء)

o o o

باب المراسلات

(۱) ..... ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا خط بنام ایڈیٹر طلوعِ اسلام

مکرمی ——— السلام علیکم

میرے پاس مختلف خیالات کے لوگوں کی طرف سے خطوط کی بھرمار رہتی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا مقصد کسی خاص مسئلہ پر بحث کرنا نہیں ہوتا بلکہ محترم پرویز مرحوم کو مطعون کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے الفاظ بھی وہی گھسے پٹے ہوتے ہیں جو یہ لوگ برسوں سے استعمال کرتے آرہے ہیں۔ ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ خط کے نیچے اپنا نام ہی لکھ دیں۔ ان اصحاب سے گذارش ہے کہ روایات کے خلاف اور ان کے حق میں پیشتر ازیں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اگر کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو بے شک سامنے لائیں۔ لیکن گھٹیا قسم کے حربوں سے اجتناب کریں۔

دوسری قسم ان اصحاب کی ہے جو روایات سے اس قدر بیزار ہیں کہ ان کے خلاف لکھتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن سے قرآن کریم کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً مرزا افضل حسین مغل از جہلم اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"روایات میں حضرت آدم کا بُت بنا کر خود ان میں سے آپ کی بیوی کو پیدا کرنا بتایا گیا ہے جو ان کے پیٹ سے پیدا ہونے کی بدولت ان کی بیٹی ہی ہو سکتی ہے، پھر ان دونوں کو میاں بیوی بنایا گیا جو کہ شریعتِ خداوندی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔ قرآن میں اللہ کا یہ اعلان بھی ہے کہ اس کے قوانین بدلتے نہیں۔ لیکن روایات لکھنے والوں نے اس سلسلے میں ایک بہت بڑا تضاد پیدا کر دیا ہے۔ اگر روایات درست ہیں تو قرآن نہ شک و شبہ سے بالاتر ہے نہ تضادات سے بری۔ اللہ نے اپنے ہی

قانون کی کیوں خلاف ورزی فرمائی"۔

محترم مرزا صاحب کا خط لمبا ہے میں نے چند الفاظ میں ان کا مدعا بیان کر دیا ہے۔

گذارش ہے کہ آدم اور حوا کا من گھڑت قصہ جو کتبِ تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے' یہ ملاؤں کے اپنے ذہن کی پیداوار بھی نہیں بلکہ مختلف بے معنی سر و پا قصے کہانیاں جو بائبل سے انہوں نے نقل کی ہیں' یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ آدم سے مراد کوئی فردِ واحد ہے ہی نہیں بلکہ اس لفظ سے مراد بنی نوع انسان ہے۔ محترم پرویز مرحوم نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب 'ابلیس و آدم' میں عمدگی سے حل کیا ہے اور میری کتاب 'مظاہرِ فطرت اور قرآن' میں یہ ایک مستقل باب ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو سائنٹیفک طریق سے حل کیا ہے۔ جو اصحاب اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ مندرجہ بالا کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال اگر قارئین طلوعِ اسلام مصر ہوں تو میں اسے مضمون کی شکل میں بھی پیش کر دوں گا۔ مشکل یہ بھی ہے کہ طلوعِ اسلام پرچہ شاید تفصیلی بیانات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں میں اب عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسانی جسم میں توانائی ختم ہو جاتی ہے اور جن مسائل کو میں پیشتر ازیں بالتفصیل بیان کر چکا ہوں' ان پر بار بار اظہارِ خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود قارئین طلوعِ اسلام' جیسا فرمائیں' میں حاضر ہوں۔

---

(۲)

محترم فضل حسین صاحب کے بے شمار خطوط کے جواب میں گذارش ہے کہ آپ چونکہ متعدد مضامین کو خلط ملط کر رہے ہیں اس لئے ہم معذرت خواہ ہیں کہ انہیں ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ البتہ ان مسائل کو قرآنی نقطۂ نظر سے الگ الگ بیان کر دیا جائے گا۔ اس کے لئے انتظار فرمائیے۔

(ادارہ)

ایک خبر

صوبہ سندھ میں زیادہ تر ڈاکو فرار ہو گئے ہیں یا حج کے لئے چلے گئے ہیں

جنرل جمشید ملک (جنگ ۱۵، جون)

اِستفسارات

۱۔ حقوق العباد کے ضمن میں کراچی سے ایک صاحب نے دریافت کیا ہے کہ کسی ایک فرد کے ذمّہ کسی دوسرے فرد یا افراد کے واجب الاذعان مواجب اگر کسی وجہ سے ادا نہ ہو پائیں تو ایسے واجبات کی ادائیگی از روئے دینِ اسلام کتنی مدت کے بعد زائد المیعاد (TIME BARRED) ہو جائے گی۔

طلوعِ اسلام قرآن کریم میں براہِ راست ایسا کوئی حکم تو ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ تاہم وراثت سے متعلق قرآنی آیات (۴:۱۱-۱۲) میں اس بات کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ لہٰذا جو ادائیگی مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی وہ اس کی زندگی میں کس طرح زائد المیعاد ہو سکتی ہے۔

۲۔ یہ سوال ہم سے پہلے بھی پوچھا گیا تھا اب بھی کم و بیش انہی الفاظ میں دہرایا گیا ہے جسے ہم قارئینِ طلوعِ اسلام سے اس درخواست کے ساتھ درج ذیل کر رہے ہیں کہ وہ اس باب میں اپنی تحقیق (بلکہ تشخیص) سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ان تمام تشخیصات کے بعد مرض کی علت اور اس کے ازالہ کی صحیح تدبیر سوچی جائے۔

مدیر طلوعِ اسلام

استفسار نہ جانے کیوں ہماری قوم بے حد جذباتی ہو چکی ہے۔ بے حد زُود رنج، جلد باز، بات بات پر بگڑ جانے والی، کوئی کسی کی بات برداشت نہیں کرتا، جوش و خروش اتنا زیادہ اور استقامت اس قدر کم، ایک ضرب المثل کے مطابق، پہل ہماری شیر کی ہوتی ہے اور پچھاڑ گیدڑ کی بھی نہیں رہتی۔ تقریریں سنیئے تو ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کے چھکّے چھڑا دیں۔ لیکن اس کے بعد عمل دیکھئے تو کہیں حرکت نام کو نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ قوم اس قدر شعلہ صفت کیوں ہے؟ کسی ایک دو کی بات ہو تو انفرادی طور پر اس کی تشخیص کر لی جائے۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ساری کی ساری قوم (جس میں مستثنیات بالکل نام کو ہیں) اسی رنگ میں کیوں رنگی ہوئی ہے؟ مجھے تو یہ سوال بہت

گہرا اور اہم نظر آتا ہے۔ میں ایک مدت سے اس کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ مسلمان من حیث القوم اس قدر مغلوب الغضب، اس قدر شعلہ صفت، اس قدر تیز مزاج کیوں ہوتے ہیں؟ ان کے تمام کام ان کی تیز مزاجی کے ہاتھوں بگڑتے ہیں۔ کسی مسلمان دکاندار سے سودا خریدیئے تو ہر وقت اپنی پگڑی کا خیال رہتا ہے کہ نہ معلوم یہ کب اسے اُچھال دے؛ کسی کاریگر سے بات کیجئے تو ہر وقت دھڑکا رہتا ہے کہ خدا خیر کرے، یہ کس وقت گالی دیدے۔ کسی سے معاملہ پڑ جائے تو ہر وقت اندیشہ رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت بات بگڑ جائے۔ ذرا سی بات خلافِ مزاج ہوئی اور یہ آگ بگولا ہو گئے۔ پھر نہ اپنے نقصان کی فکر ہے نہ کسی دوسرے کی عزت کا پاس۔ ہر چہ باداباد! میں پوچھتا ہوں کہ یہ پوری کی پوری قوم اس قسم کی کیوں ہو گئی ہے؟ آپ غور سے دیکھئے مسلمانوں میں قدرِ مشترک یہی شعلہ مزاجی ملے گی۔ اس میں کسی صوبے اور خطے کی تفریق نہیں۔ بچھو کی طرح جس کی پشت پر ہاتھ پھیریئے، نیش موجود ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ اس کی علت کیا ہے؟ ڈاکٹروں سے پوچھئے تو وہ شاید یہ کہہ دیں گے کہ یہ اعصابی کمزوری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اعصابی کمزوری کسی ایک فرد میں ہونی چاہیئے نہ کہ پوری قوم اس طبیعی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ کوئی اس کی وجہ ان کی اقتصادی کمزوری بتاتا ہے۔ لیکن اوّل تو یہ کہ ان کے دولت مندان کے غریبوں سے زیادہ شعلہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسری قوموں میں بھی ایسے ایسے غریب لوگ موجود ہیں جو ان سے بھی زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ لیکن وہاں یہ حالت ہے کہ جو زیادہ غریب ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ نرم خو ہو جاتا ہے۔ بہرحال، اس کا اطمینان بخش جواب مجھے آج تک کہیں سے نہیں مل سکا اور یہ سوال ہر وقت میرے دل کو مضطرب رکھتا ہے کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی بہت سی ناکامیوں کا راز ان کی اس کمزوری میں ہے۔ میں شکرگزار ہوں گا اگر آپ اس سوال پر پوری طرح سے روشنی ڈال کر اس کا اطمینان بخش جواب تلاش کر دیں گے۔"

جو قوم تسخیرِ فطرت کے لئے جدّوجہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتی ہے اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول میں دوسرے کی محتاجگی، لعنت، ذلّت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے

علامہ غلام احمد پرویز کا درسِ قرآنِ کریم

درج ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵ رکے۔ ایل کیہال۔ رابطہ شیخ صلاح الدین	جمعۃ المبارک	۱۰۔ بجے صبح
۲۔ بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر ۵	ہر ماہ پہلا، تیسرا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۳۔ پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ/جمعہ	۴۔ بجے شام
۴۔ پشاور	برمکان ابنِ امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴۔ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۴۰/۱۳۹، مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	۶۔ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰۔ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے بعد نمازِ جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵۔ ای بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	جمعۃ المبارک	۸۔ بجے صبح
۱۱۔ حیدر آباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	جمعۃ المبارک	۱۰۔ بجے صبح
۱۳۔ رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰۔ بجے صبح
۱۴۔ سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز، ریلوے روڈ	جمعۃ المبارک	۹۔ بجے صبح
۱۵۔ سید حسن	برمکان محترم سید محمد حسین	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	۲۳۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون ۴۲۸۵۵	جمعۃ المبارک	۴:۳۰ بجے سہ پہر

شہر	مقام	دن	وقت
۱۷۔ فیصل آباد	ڈاکٹر طارق عزیز فاؤنڈیشن، ۸۳۵/B سول کوارٹرز غلام محمد آباد۔ رابطہ فون ۳۵۴۸۳۵	جمعۃ المبارک	۵۔ بجے شام
۱۸۔ کوئٹہ	۱۶۶/ڈی، جائنٹ روڈ	〃	۴۔ بجے شام
۱۹۔ کراچی	سنووائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہِ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل) فون: ۵۷۲۲۵۱ - ۵۴۷۳۲۹	〃	۹:۳۰ بجے صبح
۲۰۔ کراچی	مکان ۱۲۰۶، گلی ۱۰، اے، بی۔ ۳۶ شریف کالونی، لانڈھی	اتوار	۸ بجے شب
۲۱۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
۲۲۔ گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	۳۔ بجے سہ پہر
۲۳۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹:۳۰ بجے صبح
۲۴۔ لیّہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	〃	بعد نماز مغرب
۲۵۔ ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	〃	۹ بجے صبح
۲۶۔ اوسلو (ناروے)	TORG GATA 26-28 OSLO-1	ہر ماہ پہلا اتوار	۴۔ بجے شام
۲۷۔ برمنگھم (یو۔کے)	229 ALUM ROCK ROAD	اتوار	۳۔ بجے سہ پہر
۲۸۔ ٹورنٹو	716 THE WEST MALL ETOBICOCK ONT. (416)650-9187(416)626-6781	ہر ماہ پہلا اتوار	۱۱۔ بجے صبح
۲۹۔ ڈنمارک	GL KONGEVEJ 47, 3TH DK 1610 KBH V	ہر ماہ آخری ہفتہ	۲۔ بجے سہ پہر
۳۰۔ لندن	76 PARK RD ILFORD ESSEX TELE 01-553-1696	ہر ماہ پہلا اتوار	۲:۳۰ بجے سہ پہر
۳۱۔ لاہور	۱۲۸۔ ایل، ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن	ہر بدھ	بعد نمازِ عشا

شہر	مقام	دن	وقت
۳۲۔ جوہرآباد	برمکان حکیم فاروق شاہ، قاضی کالونی	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۳۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۰۹ گ ب	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۴۔ ڈی جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک ۲، کچہری روڈ	جمعہ	۳ بجے سہ پہر
۳۵۔ کویت	برمکان عبیدالرحمن آرائیں صاحب فون: ۵۳۱۶۲۷۳	جمعہ	۵ بجے شام
۳۶۔ یارڈے	۶۳۳ چرچ روڈ۔ رابطہ راجہ محمد یونس B 338 HA	آخری اتوار	۲ بجے دوپہر
۳۷۔ راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم، ۳۰ ملت کالونی لکھا سنگھ سٹیٹ۔ رابطہ چوہدری نثار احمد ہائی وے آٹو گوال منڈی ۷۴۷۵۲	جمعۃ المبارک	۵ بجے شام

جو قوم تسخیرِ فطرت کے لئے جدّ وجُہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتی ہے اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول میں دوسرے کی محتاجگی، لعنت، ذلّت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے